مذہب میں کہیں تصادم نہیں، لیکن جہاں خرافات اور مذہب میں تصادم ہو جائے وہاں ظاہر ہے کہ خرافات قابل ترک ہوں گے، مصنف کے انداز بیان سے کہیں کہیں مذہب کا بھی استخفاف ہو گیا ہے، شاعری کیا ایسا ادب بھی خرافات میں شامل ہے، ان خامیوں سے قطع نظر مصنف جدید ادبی، تنقیدی رجحانات سے باخبر ہیں اور یہ مضامین انھوں نے فکر و مطالعہ کے بعد لکھے ہیں جن سے تنقیدی و ادبی بصیرت حاصل ہوتی ہے، انداز تحریر شگفتہ اور ظرافت آمیز ہے۔

میکالے کا نظریہ تعلیم ۔ مترجمہ عبد الحمید صدیقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰، قیمت عمر پتہ: ردہیلکنڈ لٹریری سوسائٹی ۱/۲ بی ون ایریا۔ لیاقت آباد کراچی ۱۹۔ ہندوستان میں: مکتبہ تجلی دیوبند یوپی

لارڈ میکالے نے برطانوی پارلیمنٹ کے ۱۸۱۳ء کے قانون کے برخلاف ۱۸۳۵ء میں نظام تعلیم کو تبدیل کرنے کے لیے گورنر جنرل کو جو یادداشت پیش کی تھی اور جس کا مقصد مشرقی علوم خصوصاً سنسکرت اور عربی تعلیم کو ختم اور انگریزی تعلیم کو رائج کر کے "ہندوستانی انگریز" تیار کرنا تھا، یہ کتابچہ ان ہی سفارشات کا شگفتہ اور سلیس ترجمہ ہے، لائق مترجم نے جابجا حواشی میں میکالے کے خیالات و دلائل کا تار و پود بکھیرا ہے، اور شروع میں ایک مفید مقدمہ میں انگریزوں کی ان مذموم کوششوں کا بھی جائزہ لیا ہے جو انھوں نے مسلمانوں کی ایمانی قوت کو ختم اور ان کو انکی تہذیب و روایات سے بیگانہ بنانے کے لیے کی تھیں، اس ضمن میں تعلیم اور قومی زبان کی اہمیت بھی ثابت کی ہے، یہ کتابچہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور انگریزوں کے بعد بھی ہند و پاک میں کم و بیش ان ہی کا نظام تعلیم رائج ہے، اس لیے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے خصوصیت سے اسکا مطالعہ مفید ہوگا۔

"ض"

جلد ۱۰۱ ۔ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۸ء ۔ عدد ۶

مضامین

مقالات

شذرات

مسلسل یک طرفہ فسادات، بد امنی، لاقانونیت اور بیرونی ملکوں میں ہندوستان کی بدنامی نے بالآخر حکومت، کانگریس، دوسری ترقی پسند پارٹیوں اور سنجیدہ طبقوں کے ضمیر کو بیدار اور فسادات کے انسداد کی تدبیروں پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیا، بہت سے ہندو مفکرین نے اس کے خلاف مضامین لکھے، جن میں ان فسادات کے اصلی اسباب، فرقہ وارانہ ذہنیت اور اسکے نتائج کا بڑا صحیح اور منصفانہ تجزیہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ہندوستان کا ضمیر زندہ ہے، یہاں انسانیت کی شمع گل نہیں ہوئی ہے، اور سیکولرزم اور جمہوریت کے سچے پرستار موجود ہیں، ضرورت ہے کہ اس جذبہ کو عام کیا جائے اور فسادات کے انسداد میں خارجی تدبیروں کے ساتھ اس کے بنیادی اسباب کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

ان فسادات کے اسباب مذہبی سے زیادہ سیاسی ہیں، فرقہ پرور پارٹیوں کے پاس حصولِ حکومت کے لیے کوئی تعمیری پروگرام نہیں ہے، اس کے لیے انھوں نے مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنایا ہے، اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف سیاسی اور تاریخی اسباب کی بنا پر، آزادی کے پہلے سے ایک جماعت ایسی موجود ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کو اجنبی اور بیرونی حملہ آور سمجھتی ہے، اور ان کو ملکی حقوق میں برابر کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے، اسکا کام اسلام اور مسلمانوں کی غلط تصویر پیش کر کے، ان کے خلاف نفرت پھیلانا ہے، آزادی سے پہلے یہ جماعت غیر موثر تھی، کانگریس نے بھی جبتک وہ اپنے اصولوں پر قائم اور ملک کی خدمت گذار رہی اس جماعت کو ابھرنے نہیں دیا، آزادی کے بعد کچھ ملک کی تقسیم اور کچھ کانگریس اور اس کی حکومت کی غلطیوں کی وجہ سے اس کو ابھرنے کا موقع مل گیا، اور اب وہ اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ کانگریسی حکومت کے ساتھ جمہوریت اور سیکولرزم کیلئے بھی خطرہ بنگئی ہے۔

معارف نمبر ۶ جلد ۱۰۱ ۴۰۳ شذرات

اس قسم کی پارٹیوں کے پاس دو بڑے حربے ہیں، ایک ہندی زبان، ہندو قوم اور ہندو کلچر کے احیاء کا نعرہ، دوسری مسلمانوں پر الزام تراشی وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تاریخوں سے ایسے واقعات نکالتی بلکہ گڑھتی ہیں جن سے اسلام اور مسلمانوں سے نفرت پیدا ہو، اور اس کے ذریعہ وہ عوام میں مقبولیت حاصل کر سکیں، بدقسمتی سے یہ ذہنیت اتنی عام ہو گئی ہے کہ اس سے کوئی طبقہ بھی خالی نہیں ہے، چنانچہ تاریخوں اور نصاب کی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں سے نفرت کا سبق پڑھایا جاتا ہے، اور تقریروں اور تحریروں کے ذریعے اس زہر کو مسلسل پھیلایا جاتا ہے، بالفرض اگر کچھ ایسے واقعات مل بھی جائیں تو کس قوم کے حکمرانوں کا دامن اس سے پاک ہے، اچھے برے حکمراں ہر قوم میں ہوتے ہیں، کیا ہندو حکمرانوں نے ہندوؤں پر اور مسلمان بادشاہوں نے مسلمانوں پر ظلم نہیں کیے ہیں، اسکی ذمہ داری موجودہ مسلمانوں پر کیا ہے، اس کے مقابلہ میں اچھے حکمرانوں کی بھی کمی نہیں ہے، جنھوں نے بڑے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی اور اپنے کارناموں سے ہندوستان کو جنت نشان بنایا جس کا اعتراف ہندو مورخین تک کو ہے، جب دونوں قسم کے واقعات ملتے ہیں تو اچھے واقعات کو چھوڑ کر برے واقعات کو اچھالنے کی کیا ضرورت ہے، پھر حکمرانوں کے پیش نظر زیادہ تر زیادہ حکومت کے مصالح ہوتے تھے، اس لیے کسی مسلمان بادشاہ کے عمل کو مذہبی رنگ دینا صحیح نہیں ہے، اور تاریخ تو ایک خام مواد ہے، اس سے مورخ اپنے ذوق کے مطابق مختلف شکلیں بنا سکتا ہے، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ترقی پذیر قومیں ملک کی تعمیر و ترقی میں حال و مستقبل کے تقاضوں کو دیکھتی ہیں، ماضی کے ایسے واقعات پر نظر نہیں ڈالتیں جو ملک کی تعمیر و ترقی میں حارج ہوں، اگر پرانی تاریخ کے اوراق ہی الٹنا ہیں تو مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کی تاریخ اور بھی تاریک نظر آئے گی، یہ وقت پرانی تاریخ کے دہرانے کا نہیں بلکہ نئی تاریخ بنانے کا ہے، مسلمان ہندوستان کی تاریخ کے جزو اعظم ہیں، اور آئندہ بھی رہیں گے، ان کو نظر انداز کر کے ہندوستان کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی اور نہ وہ آئندہ ترقی کر سکتا ہے۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

اس بحث کا حاصل ہے کہ فرقہ پروری کو روکنے کے لیے خارجی تدبیروں کے ساتھ اسکے

اندرونی اور اصلی اسباب کا ازالہ بھی ضروری ہے، یعنی مسلمانوں کے بارہ میں صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے کی کوشش کیجائے، تاریخ نصاب کی کتابوں اور اخبارات کے ذریعہ جو زہر پھیلایا جارہا ہے اس کو روکا جائے، نصاب میں ایسی کتابیں لکھی جائیں جو دونوں فرقوں کے کلچر کی ترجمان ہوں، جن سے ان میں دوری اور نفرت کے بجائے اتحاد و یگانگت پیدا ہو، ایک دوسرے کے بارہ میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے دور کرنے کی کوشش کیجائے، یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ ایک ہزار سال تک ساتھ رہنے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے مذہب سے پوری طرح واقف نہیں بلکہ انکے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اس غلطی کا احساس لوگوں کو اب ہوا ہے، مگر دارالمصنفین نے شروع سے اسکا لحاظ رکھا، یہاں کے مصنفین اور اہل قلم نے ہندو مسلمانوں کو قریب لانے اور پرانی غلط فہمیوں کو دور کرنے کیلئے سیکڑوں مضامین اور مستقل کتابیں لکھیں، خارجی تدبیروں سے فسادات کی شدت میں تو کمی آسکتی ہے مگر اسکا پورا انسداد نہیں ہوسکتا، وہ اسی وقت ختم ہوسکتے ہیں جب فرقہ پروروں کا پھیلایا ہوا زہر دور ہوگا، اسکی سب سے بڑی ذمہ داری صحیح نقطۂ نظر رکھنے والے اہل قلم پر ہے، اسوقت ملک میں جو اچھا رجحان پیدا ہو گیا ہے اس سے ہندو مسلمان دونوں کو فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا چاہیے۔
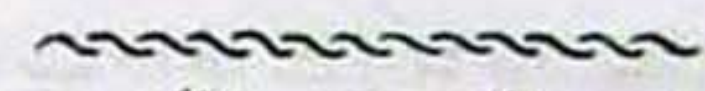
~~~~~~~~

اعظم گڈھ عربی مدارس کا ایک بڑا مرکز ہے، مئو، مبارکپور اور سرائمیر میں بڑے بڑے مدارس موجود ہیں، اسلیے موجودہ ناسازگار حالات میں کسی نئے مدرسہ کی گنجایش مشکل ہی سے نکل سکتی ہے، مگر ابھی چند سال ہوئے کچھ باہمت مسلمانوں اور نوجوان علما، نے اعظم گڈھ کے قریب قصبہ بلریا گنج میں جامعۃ الفلاح کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی، اصل میں یہ ایک مکتب تھا، اسکی عمارت بھی بہت معمولی سفالہ پوش تھی، اسی میں عربی کی تعلیم شروع کردی گئی اور اسکے کارکنوں کے اخلاص، ہمت اور متحدہ کوششوں سے چند سال کے اندر یہ مکتب عربی کا ایک مکمل مدرسہ بن گیا جس میں عربی کی پوری تعلیم کے ساتھ انگریزی، ہندی اور بعض نئے ضروری علوم کی بھی تعلیم ہوتی ہے، اسکے طلبہ کی تعداد کئی سو تک پہنچ گئی ہے، کئی شاندار عمارتیں اور ایک وسیع ہوسٹل بن گیا ہے، اب اسی پیمانہ کی ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے، مدرسہ جس رفتار سے ترقی کررہا ہے، اس سے امید ہے کہ وہ آیندہ نہ صرف اعظم گڈھ بلکہ پورے صوبے کا ممتاز مدرسہ بنجائیگا، اس دور میں عربی مدارس ہی وہ قلعے ہیں جن کے ذریعے مسلمانوں کا مذہب، انکی تہذیب و روایات محفوظ رہ سکتی ہیں، اسلیے جامعۃ الفلاح مسلمانوں کی امداد اور ہمت افزائی کا مستحق ہے، اور ہم کو امید ہے کہ وہ مدرسہ کی امداد خصوصاً اس کی مسجد کی تعمیر میں فیاضی سے حصہ لیں گے

مقالات

ابن الفارض

عربی صوفیانہ شاعری کی ایک منفرد شخصیت

از

جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی

شیخ ابوحفص شرف الدین عمر بن الفارض کا شمار اسلام کے ممتاز صوفیہ میں ہوتا ہے اور وہ عربی صوفیانہ شاعری کے امام مانے جاتے ہیں، چھٹی صدی ہجری کے نصف آخر میں یہ آفتاب طلوع ہوا اور ساتویں صدی ہجری کے ربع اول میں نصف النہار پر پہنچ گیا، یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی تصوف مدارجِ ارتقاء کو طے کرتا ہوا نقطۂ عروج کو پہنچ رہا تھا، ایک طرف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے صوفیانہ افکار کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا، دوسری طرف ابن الفارض کی شاعری کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے، گویا عربی تصوف کے آفتاب اور ماہتاب دونوں ساتھ ساتھ اپنی اپنی چمک دمک سے دنیا کو منور کر رہے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی کی صوفیانہ شاعری فارسی کے مقابلہ میں بہت پست ہے، اس لیے ابن الفارض کو رومی اور عطار کی صف میں کھڑا نہیں کیا جاسکتا، تاہم جہاں تک صرف عربی زبان کے صوفی شعراء کا تعلق ہے، ابن الفارض نہ صرف اپنے دور کے امام تھے
~~~~~~~~

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آج تک اس میدان میں ان کا کوئی حریف پیدا نہ ہو سکا، خود ابن عربی کی شاعری ابن الفارض کے قصائد سے آنکھیں نہیں ملا سکتی، اگرچہ ابن عربی کا مرتبہ عربی نثر میں اتنا بلند ہے کہ ان کی صوفیانہ تحریروں کے مقابلہ میں فارسی نثر بھی کوئی جواب پیش نہیں کر سکتی" اس طرح ابن الفارض ہی کو عربی تصوف کے شاعر اعظم ہونے کا فخر حاصل ہے،

کسی شاعر کے کلام کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی کتاب زندگی کے اوراق کو پلٹا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے افکار و خیالات کے سرچشمے کیا ہیں، اسکے رجحانات و میلانات کی سمتیں کن حالات میں اور کس طرح متعین ہوئی ہیں اور کن واقعات و حوادث نے اس کے قلب و ذہن پر کیا اثرات ڈالے ہیں، اس مقصد کے پیش نظر جب ہم ابن الفارض پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو بڑی مایوسی ہوتی ہے، کیونکہ ان کی زندگی کا اکثر حصہ ابتک پردۂ خفا میں ہے، تذکروں میں جو کچھ ملتا ہے وہ بہت ہی مختصر اور ناکافی ہے۔

سب سے پہلے شیخ ابن الفارض کے نواسے شیخ علی نے ان کے قصائد کو باضابطہ طور پر صحت کے ساتھ جمع کیا تھا اور اس کے مقدمہ میں شیخ کے کچھ حالات بھی درج کر دیے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے تذکرہ نویسوں نے زیادہ تر اسی سے خوشہ چینی کی ہے،[1] شیخ علی نے بھی زندگی کے مرتب حالات پیش نہیں کیے ہیں، بلکہ کچھ متفرق واقعات و حالات جمع کر دیے ہیں، جو زیادہ تر کرامات ہیں یا کرامات کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔

عقیدتمندوں کا تو ہمیشہ ہی سے یہ طریقہ رہا ہے کہ بزرگوں کی زندگی میں سب سے زیادہ

---

[1] راقم الحروف کے سامنے بھی شیخ علی ہی کا بیان ہے جو شرح دیوان ابن الفارض مرتبہ رشید بن غالب مطبوعہ مصر ۱۳۰۶ھ کے مقدمہ میں موجود ہے، اس کے علاوہ دیگر متعدد تصانیف بھی پیش نظر رہی ہیں جن میں سے چند اہم کتابوں کے حوالے اپنے مقامات پر دیے جائیں گے۔

کرامات ہی سے ان کو دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے رفتہ رفتہ زندگی کے اصل واقعات تاریکی میں چلے جاتے ہیں یا ان پر کرامات کا رنگ چڑھ جاتا ہے اور ان کی ساری زندگی چند خوارق و کرامات ہی کے اندر محصور ہو کر رہ جاتی ہے، ابن الفارض کی زندگی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

یہ بھی ہوتا آیا ہے کہ جب کسی چمن میں کوئی دیدہ ور جانِ بہار بن کر نمودار ہوتا ہے، تو مشتاقانِ جمال اس کے رنگ و بو کی رعنائیوں میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ کسی کو یہ سوچنے کا ہوش ہی نہیں رہتا کہ یہ پودا کس مٹی سے اگا ہے، کس آب و ہوا نے اس کو پروان چڑھایا ہے، کس باغبان نے اس کی نگہداشت کی ہے، کن ہواؤں نے اسے تازگی عطا کی ہے اور کن شعاعوں نے اس کو یہ آب و رنگ بخشا ہے، چنانچہ شیخ کے معجز نما کلام کی آب و تاب سے بھی اہل زمانہ اس درجہ مسحور تھے کہ ان کو شیخ کی زندگی کے دوسرے خد و خال کی طرف نظر اٹھانے کا خیال نہ رہا اور جب ایک عرصۂ دراز کے بعد یہ طلسم ٹوٹا اور اہل نظر کی آنکھیں کھلیں تو اس وقت تک زمانہ اپنا کام پورا کر چکا تھا، اور شیخ کی زندگی کے حالات کا سفینہ بحر ظلمات میں غرق ہو چکا تھا۔

بہرحال کچھ بکھرے ہوئے تار و پود اس تحریر میں پیش کیے جا رہے ہیں، اور امید ہے کہ اہل بصیرت ان ہی کے پردوں پر اصل حقائق کی کچھ جھلکیاں دیکھ لیں گے۔

ولادت و نسب | شیخ ابن الفارض کی ولادت ذوالقعدہ کی چوتھی تاریخ ۵۷۶ھ[1] کو قاہرہ میں ہوئی، ان کا سلسلۂ نسب بنو سعد تک پہنچتا ہے جو نبی عربیؐ کی دائی حلیمہ سعدیہ کا قبیلہ تھا، آبائی

---

[1] شیخ کے سال ولادت میں اختلاف ہے، ابن خلکان نے وفیات الاعیان ج ۳ ص ۱۲۶، رقم ۴۰۴ میں ۵۷۶ھ تحریر کیا ہے اور یہی مقدمۂ دیوان (مرتبہ خلیل الخوری، مطبوعہ بیروت ۱۸۹۹ء) میں بھی درج ہے، لیکن شذرات الذہب ج ۵ ص ۱۴۹ میں ۵۷۷ھ ملتا ہے اور مقدمۂ شرح دیوان (مرتبہ رشید بن غالب مطبوعہ مصر ۱۳۰۶ھ) میں صفحہ ۳ پر ۵۵۶ھ یا ۵۶۶ھ دیا ہوا ہے جبکہ اسی مقدمہ میں ص ۱۳ پر ۵۷۶ھ درج ہے۔

وطن شام کا مشہور و معروف اور مردم خیز مقام حماۃ ہے، لیکن ان کے والد ابو الحسن علی بن المرشد
وطن سے ہجرت کر کے مصر چلے آئے تھے، ان کو علم الفرائض سے گہری واقفیت تھی، چنانچہ اسی سے
متعلق قاہرہ کے محکمۂ قضا میں وہ ایک اہم خدمت پر مامور ہوگئے تھے، اس تعلق سے ان کا لقب الفارض
ہوگیا اور اسی نسبت سے ان کے صاحبزادے بعد میں ابن الفارض کہلائے، کچھ عرصہ کے بعد
شیخ کے والد کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن انھوں نے اسے قبول نہیں کیا، اور
ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ اس کے بعد باقی زندگی جامع ازہر کے قاعۃ الخطابۃ میں گوشہ نشیں
ہوکر عبادت و ریاضت میں گذار دی۔

تعلیم و تربیت شیخ کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد ماجد کا بڑا حصہ معلوم ہوتا ہے، اور جیسا کہ
اوپر کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، شیخ کے والد ایک عابد و زاہد اور صوفی منش بزرگ تھے،
ساتھ ہی علم و فضل میں بھی ان کو ایک بلند مقام حاصل تھا، چنانچہ مجالسِ قضا کے علاوہ ان کے
یہاں علمی مجلسیں بھی ہوا کرتی تھیں، جن سے تشنگانِ علم سیراب ہوتے تھے، اس طرح ابن الفارض
نے زہد و تقویٰ کے ماحول میں آنکھ کھولی اور اسی کے آغوش میں ان کی نشو و نما ہوئی،
عربی کا یہ مشہور شعر ان کے حال پر پوری طرح صادق آتا ہے:-

أتانی هواها قبل ان اعرف الهوی   فصادف قلبی فارغا فتمکنا

(ابھی مجھے محبت کا کچھ شعور بھی نہ تھا کہ اس کی محبت میرے پاس آگئی اور میرے دل کو
جو خالی پایا تو اسی میں جاگزیں ہوگئی)

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے   اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

غرض ابن الفارض کی تربیت زہد و عبادت، عفت و قناعت اور صلاح و تقویٰ
کے سایے میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم[1] اپنے والد ماجد سے حاصل کی، جب عنفوانِ شباب کو پہنچے تو

۱؎ شذرات الذہب لابن عماد، مصر ۱۳۵۱ھ ج ۵، ص ۱۴۹

فقہ شافعی کی تحصیل کی اور علم حدیث ابن عساکر سے حاصل کیا۔[1]

خاندان اور اہل و عیال ابن الفارض کا گھرانا خوشحال تھا، دولت و ثروت کی فراوانی تھی،
ہر قسم کے آسایش کے سامان موجود تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شروع ہی سے
عیش و عشرت کی زندگی کچھ زیادہ پسند نہ تھی، اور فقر و فاقہ اور سادگی و قناعت کی طرف طبیعت کا
میلان تھا، لیکن انھوں نے تجرد کی زندگی پسند نہیں کی، بلکہ ازدواجی زندگی بسر کی، ان کے
دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک بیٹے کا نام کمال الدین محمد اور دوسرے
کا عبد الرحمٰن تھا[2]، صاحبزادی کا حال کچھ معلوم نہیں ہوسکا، البتہ ابن الفارض کے ایک
نواسے شیخ علی کا نام اس حیثیت سے زندہ ہے کہ انھیں نے سب سے پہلے اپنے نانا کے دیوان
کو قاعدہ سے مرتب کیا اور ان کے کچھ سوانح حیات بھی مختصر طور پر اس کے مقدمہ میں
درج کیے۔

خلوت و گوشہ نشینی ابن الفارض میں زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کا شوق تو گھر کے
ماحول اور والد بزرگوار کی صحبت و تربیت ہی کے اثر سے پیدا ہوچکا تھا، ان کی صوفیانہ
زندگی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کبھی کبھی گھر کی زندگی اور آبادی سے ان کو بڑی وحشت ہوتی
تھی اور خلوت و عزلت کا اشتیاق غالب ہوجاتا تھا، اس وقت وہ اپنے والد سے اجازت
لیکر کوہ مقطم پر چلے جاتے اور وہیں دن رات قیام کرتے، ان کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ کچھ عرصہ تک

۱؎ یہ ابن عساکر مشہور و معروف ابو القاسم بن علی صاحب "تاریخ دمشق" نہیں ہیں کیونکہ انکی وفات ۵۷۱ھ میں ہوچکی تھی
بلکہ یہ انکے صاحبزادے القاسم بن علی ہیں جن کا وطن اگرچہ دمشق تھا لیکن وہ مصر بھی گئے تھے، اور اہل مصر نے ان سے
علم حدیث اخذ کیا تھا۔ ملاحظہ ہو:- میزان الاعتدال للذہبی مصر ۱۳۲۵ھ ج ۲ ص ۳۶۶ اور الاعلام للزرکلی ج ۶ ص ۱۱

۲؎ دیکھئے مقدمہ شرح دیوان ص ۱۱

اسی طرح خلوت میں زندگی گذاریں، لیکن والد ماجد کی شفقت و محبت اور انکے تعلق خاطر کا خیال کر کے جلد ہی گھر واپس آجاتے تھے۔ ان کا یہ معمول والد بزرگوار کی زندگی میں اسی طرح جاری رہا، ان کے انتقال کے بعد خلوت[1] اور ان کی طرف زیادہ توجہ کی، اکثر آبادی سے باہر پہاڑی پر نکل جاتے اور وہیں مراقبہ و محاسبہ میں وقت گذارتے، لیکن اس راستے میں ان کے کسی استاد اور مرشد کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک عرصہ تک وہ اسی طرح خلوت و عزلت اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہے، مگر ابتک ان کو شرح صدر حاصل نہ ہو سکا اور معرفتِ الٰہی کا دروازہ ان پر نہ کھلا جس کا ان کو خود بھی بہت زیادہ احساس تھا۔

سفر حجاز اسی اثنا میں ایک دن ان کے ساتھ ایک خاص واقعہ پیش آیا، جس کی بنا پر انھوں نے حجاز کا سفر کیا، یہ واقعہ ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی تفصیل[2] یہ ہے کہ ایک دن وہ حسب معمول اپنی سیاحت سے واپس آئے، اور مدرسہ سیوفیہ[3] میں داخل ہو گئے وہاں انھوں نے ایک بوڑھے بقال (سبزی فروش) کو دیکھا جو وضو کر رہا تھا، لیکن اس کا وضو طریقۂ مسنونہ کے مطابق نہ تھا، ہاتھوں کو دھونے کے بعد وہ پاؤں دھونے لگا پھر سر کا مسح کیا اور منھ دھونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھکر ابن الفارض نے اس سے کہا "اے بوڑھے! تیری یہ عمر اور تو یہاں مدرسہ کے دروازہ پر علماء و فقہاء کے درمیان اس طرح بے ترتیب وضو کر رہا ہے"۔ یہ سن کر اس نے ابن الفارض کی طرف دیکھا اور کہا "اے عمر! تم کو مصر میں رہ کر شرح صدر حاصل نہیں ہو سکتا، تم کو تو مکہ کرمہ ہی میں یہ مقام حاصل ہو گا، اور اب اس کا وقت آگیا ہے

[1] نفحات الانس جامی، تہران ۱۳۳۶ھ شمسی ص ۵۳۹ [2] ملاحظہ ہو: مرآۃ الجنان للیافعی مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۳۹ھ ج ۴ ص ۷۵؛ نفحات الانس جامی مطبوعہ تہران ۱۳۳۶ھ شمسی ص ۵۴۰ [3] مدرسہ سیوفیہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے قائم کیا تھا جو حنفیہ کیلئے مخصوص تھا، دیکھئے حسن المحاضرہ للسیوطی مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ ج ۲ ص ۱۸۵

لہٰذا تم فوراً مکہ کا قصد کرو"۔ ابن الفارض کہتے ہیں کہ اس کی اس بات سے میں نے سمجھ لیا کہ یہ شخص اولیاء اللہ میں سے ہے، غلط طریقے سے وضو کر کے اس لیے اپنی جہالت کا اظہار کر رہا ہے اور بظاہر سبزی فروشی کے کاروبار میں لگا ہوا ہے کہ تاکہ اس کا مرتبہ کسی پر ظاہر نہ ہو اور وہ گمنامی و بے سروسامانی کے ساتھ زندگی گذار دے۔ یہ سوچ کر ابن الفارض اس کے پاس بیٹھ گئے، اور عرض کیا "حضرت! کہاں میں اور کہاں مکہ۔ ایام حج کے علاوہ اور کسی زمانہ میں کوئی قافلہ بھی ادھر نہیں جاتا، اس لیے میں اس وقت وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں"۔ شیخ بقال نے نظر اٹھائی اور ہاتھوں سے اشارہ کر کے فرمایا کہ مکہ تو یہ تمھارے سامنے ہی ہے، ابن الفارض کہتے ہیں کہ میں نے جو آنکھ اٹھائی تو واقعی مجھے بھی مکہ سامنے نظر آیا، اور اسی وقت میں اسی رخ پر چل پڑا۔ چنانچہ اس سفر میں مکہ برابر میری نگاہوں کے سامنے رہا، یہاں تک کہ اس کے قریب پہنچ گیا، اور جیسے ہی اس میں داخل ہوا میرے دل کے اوپر سے پردہ اٹھ گیا اور سینہ کھل گیا۔

قیام حجاز اس طرح ابن الفارض حجاز پہنچ گئے، جہاں انھوں نے تقریباً پندرہ سال[1] تک قیام کیا، اس عرصہ میں مسلسل عبادت و ریاضت، تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن میں لگے رہے، زیادہ تر مکہ کی وادیوں اور پہاڑیوں میں اپنا وقت گذارتے تھے، یہاں تک کہ وہاں کے جنگلی جانوروں سے بھی مانوس ہو گئے تھے، جیسا کہ اپنے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے:-

وجنّبني حبّيك وصل معاشري	وحبّبني ما عشت قطع عشيرتي
وأبعدني عن أربعي بعد أربع	شبابي وعقلي وارتياحي وصحّتي
فلي بعد أوطاني سكون إلى الفلا	وبالوحش أنسي اذ من الانس وحشتي[2]

(ترجمہ) تیری محبت نے مجھے میرے ساتھیوں سے جدا کر دیا اور زندگی بھر کیلئے خاندان سے

[1] یافعی نے قیام حجاز کی مدت بارہ سال لکھی ہے [2] دیکھئے دیوان ابن الفارض مرتبہ خلیل الخوری ص ۲۲

قطع تعلق کو میری نظروں میں محبوب بنا دیا، اور مجھ سے میرے شباب عقل، راحت اور صحت بادون کو چھین لینے کے بعد میرے دیار سے مجھے دور کر دیا۔ پس اب وطن چھٹنے کے بعد میرے لیے دشت ہی میں سکون ہے اور جنگلی جانوروں سے مجھے انسیت ہے کیونکہ انسانوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔)

اس موقع پر بیساختہ حضرت داغ کا یہ شعر یاد آگیا ہے:

ہوش و حواس، تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

قیام حجاز کی اس پندرہ سال کی طویل مدت میں شیخ کے متعلق کوئی خاص واقعہ نہیں ملتا اور نہ ان کی زندگی کی کچھ تفصیل ملتی ہے کہ یہ زمانہ انھوں نے کس طرح گذارا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ وقت حرم شریف کے اندر مشائخ عظام اور مجاورین کرام کے درمیان گزارتے رہے ہوں گے اور کچھ مدت کے لیے مکہ کی وادیوں اور پہاڑیوں میں عزلت گزیں ہو جاتے رہے ہوں گے، جیسا کہ مصر میں ان کا معمول تھا، اور کبھی کبھی دل کے جذبات احساسات جوش کے عالم میں اشعار بن کر زبان پر آجاتے رہے ہوں گے، بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ مکہ ہی میں ان کو اعلیٰ روحانی مقام حاصل ہوا، اور یہیں ان کی شاعری میں آب و تاب پیدا ہوئی۔

حجاز سے واپسی

پندرہ سال کے بعد ایک بار پھر شیخ بقال ہی سے متعلق ایک دوسرا واقعہ پیش آیا، جس کا خلاصہ یہ[1] ہے کہ ابن الفارض کو شیخ کی آواز سنائی دی کہ وہ ان سے کہہ رہے ہیں کہ میری وفات کا وقت قریب آگیا ہے تم فوراً آجاؤ، یہ آواز سن کر ابن الفارض اسی وقت حجاز سے روانہ ہو گئے، قاہرہ پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ واقعی شیخ بقال کا آخری وقت قریب آگیا ہے، انھوں نے ابن الفارض کو کچھ وصیت کی پھر واصل بحق ہو گئے، ان کی وفات کے بعد ابن الفارض نے ان کی وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین کی۔

۱؎ تفصیل کیلئے دیکھئے مقدمہ شرح دیوان ص ۵ اور نفحات الانس للجامی ص ۵۴۰-۵۴۱

شیخ حجاز سے واپس تو چلے آئے لیکن اس کی یاد زندگی بھر ان کو ستاتی رہی، چنانچہ مقامات حجاز کا ذکر ان کی شاعری کا مستقل موضوع ہے، جو اکثر قصائد میں بڑی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے، درحقیقت سرزمین حجاز کا ذرہ ذرہ ان کے دل میں پیوست ہو گیا تھا، کیونکہ وہیں ان پر معارف الٰہیہ اور واردات غیبیہ کا فیضان ہوا تھا، ایک مقام پر[1] خود فرماتے ہیں:

یا سمیری روّح بمکّۃ روحی — شادیا ان رغبت فی اسعادی
کان فیہا انسی ومعراج قدسی — ومقامی المقام والفتح بادی[2]

ترجمہ: (اے میرے ساتھی! اگر تو میری کچھ مدد کرنی چاہتا ہے تو خوش الحانی کے ساتھ مکہ کا ذکر سنا کر میری روح کو تسکین دے، مکہ ہی میں مجھے انسیت حاصل ہوئی اور وہیں بارگاہ قدس کی اعلیٰ منزلوں تک رسائی نصیب ہوئی، جب کہ میرا قیام مقام ابراہیم میں تھا اور فیضان ربانی کا دروازہ پورا کشادہ تھا)

شہرت و عظمت

قاہرہ واپس آنے کے بعد شیخ بہت جلد ایک صوفی صافی، عارف کامل اور باکمال شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے اور عقیدتمندوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا، لوگ آپ کی زیارت کے بہت مشتاق رہتے تھے، چنانچہ جب آپ شہر میں نکلتے تو عوام ٹوٹ پڑتے، مصافحہ کرتے، ہاتھوں کو بوسہ دینے کی کوشش کرتے اور خیر و برکت کی دعا کے طالب ہوتے، عوام کے علاوہ بہت سے خواص بھی آپ کے عقیدتمندوں میں شامل تھے، فقراء، مشائخ، علماء، فقہاء اور وزراء و امراء کی ایک بڑی جماعت آپ کی معتقد تھی، جو زیارت کے لیے خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے، آپ کے سامنے نہایت ادب سے بیٹھتے، اور آپ کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے،

۱؎ دیوان ابن الفارض، ص: ۵،

۲؎ سمیر: رات میں قصہ سنانے والا۔ شادی: گانے والا۔

یہاں تک کہ خود بادشاہِ وقت سلطان الملک الکامل[۱] آپ کے نیازمندوں میں شامل تھا اور زیارت کا بہت مشتاق رہتا تھا۔

سلطان الملک الکامل کے دربار میں شیخ کا تذکرہ

اس زمانہ میں الملک الکامل مصر کا حکمراں تھا، اس کے سامنے شیخ ابن الفارض کا ذکر پہلی بار ایک خاص تقریب سے آیا تھا[۲]، سلطان کو علماء و صلحاء سے بڑی محبت تھی، وہ مخصوص مجلسوں میں ان کو شریک کرتا تھا، شعر و سخن سے بھی اس کو دلچسپی تھی، اس لیے کبھی کبھی ادبی گفتگو بھی ہوا کرتی تھی، ایک دن مشکل قوافی کا ذکر چھڑ گیا، سلطان نے کہا کہ سب سے مشکل قافیہ یائے ساکنہ ہے، اس قافیہ میں جس کو جتنے اشعار یاد ہوں وہ پیش کرے، حاضرین میں متعدد لوگوں نے اس قافیہ میں اشعار سنائے، لیکن دس شعر سے زیادہ کوئی نہ سنا سکا، اس وقت سلطان نے کہا کہ مجھے ایک ہی قصیدہ کے پچاس شعر اس قافیہ میں یاد ہیں، اور یہ اشعار اسی وقت سنا دیے، سب نے ان کو بہت پسند کیا، اس وقت قاضی شرف الدین سلطان کے پرائیوٹ سکریٹری بھی موجود تھے، انھوں نے کہا کہ مجھے ایک ہی قصیدہ کے ڈیڑھ سو اشعار اس قافیہ میں یاد ہیں، اس پر سلطان کو بڑی حیرت ہوئی، اس نے کہا مجھے یہ قافیہ بہت پسند ہے، میرے کتب خانہ میں جاہلی اور اسلامی شعراء کے اکثر دواوین موجود ہیں، لیکن جتنے اشعار میں نے سنائے ان کے علاوہ اور کوئی شعر مجھے نہیں ملا، اور سلطان کے مطالبہ پر قاضی شرف الدین نے شیخ ابن الفارض کا وہ قصیدہ سنایا جس کا مطلع یہ ہے:۔

سائق الاظعان یطوی البید طی　　منعماً عرج علی کثبان طی[۳]

(اے ساربان جو وسیع میدانوں کو طے کرتا چلا جا رہا ہے از راہ کرم قبیلہ طے کے ٹیلوں پر تھوڑی سی دیر کیلئے ٹھہر جا۔)

۱؎ الملک الکامل ایوبی سلاطین میں سے ہے جو ۶۱۵ھ تا ۶۳۵ھ مصر کا فرمانروا رہا، شعر و سخن سے اسکی دلچسپی کیلئے دیکھئے حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۲ مصر ۱۲۹۹ھ ص ۴۴ اور دیگر حالات کے لیے ملاحظہ ہو بدائع الزہور لابن ایاس مصر ۱۳۱۱ھ ج ۱ ص ۷۷، ۲؎ ملاحظہ ہو مقدمہ شرح دیوان ص ۱۰۰ ۳؎ اظعان جمع ظعینہ: محمل میں بیٹھی ہوئی عورت، البید جمع بیداء: بیابان صحرا

سلطان نے اس قصیدہ کو بہت پسند کیا اور کہا کہ ایسا قصیدہ میں نے آج تک نہیں سنا، اس میں تو کسی عاشق صادق کی روح معلوم ہوتی ہے، یہ کس کا قصیدہ ہے؟ قاضی شرف الدین نے جواب دیا، شیخ عمر بن الفارض کا جو حجاز میں مجاور تھے، ان دنوں قاہرہ آگئے ہیں اور جامع ازہر کے قاعۃ الخطابۃ میں مقیم ہیں۔

سلطان کا شوق زیارت

یہ سنکر سلطان کو ابن الفارض کی ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا، اس نے قاضی شرف الدین کو ایک ہزار دینار دے کر حکم دیا کہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر میرا سلام پہنچاؤ اور یہ نذر پیش کرو، جب وہ قبول کرلیں تو حصول برکت کے لیے ان سے یہاں تشریف لانے کی درخواست کرو، قاضی نے معذرت کی اور کہا کہ وہ نہ یہ نذر قبول کریں گے اور نہ یہاں تشریف لائیں گے، الگر سلطان کے اصرار پر قاضی صاحب کو چار و ناچار اس کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی، مگر شیخ نے نذر قبول نہیں کی اور قاضی صاحب سے فرمایا کہ تم نے سلطان کے سامنے میرا ذکر کیوں کیا، اب تم ایک سال تک میرے پاس نہ آنا، قاضی نے واپس جاکر سلطان سے واقعہ بیان کیا اور کہا کہ دنیا کی مفارقت میرے لیے آسان تھی، لیکن شیخ کی مفارقت ناقابل برداشت ہے۔

اس کا سلطان پر بڑا اثر ہوا، اس کا اشتیاق اور بڑھ گیا، اس نے کہا کہ ایسا شیخ میرے زمانہ میں موجود ہو اور میں اس کی زیارت سے محروم رہوں! اس لیے وہ خود رات میں چھپکر شیخ کی زیارت کے لیے نکلا، اس کے ساتھ فخر الدین عثمان الکاملی اور امرائے خاص کی ایک جماعت بھی تھی، کچھ دیر سلطان نے مہمندار کے مکان میں قیام کیا جو جامع ازہر کے سامنے ہی تھا، پھر عشاء کے بعد جامع ازہر میں داخل ہوا، شیخ کو جیسے ہی اس کا پتہ چلا وہ فوراً دوسرے دروازہ سے باہر نکل گئے، اور اسکندریہ کی طرف چلے گئے اور منار میں جاکر قیام کیا۔

کچھ دنوں کے بعد پھر قاہرہ واپس آگئے اور ان کی واپسی کی خبر سلطان کو ہوگئی، لیکن اس وقت شیخ کا مزاج زیادہ ناساز تھا، سلطان نے فخر الدین عثمان الکاملی کو آپ کی خدمت میں بھیجکر درخواست کی کہ اگر اجازت ہو تو شیخ کے لیے امام شافعی کے روضہ میں ایک قبر بنوا دی جائے، مگر انھوں نے اس کی اجازت نہ دی۔ پھر سلطان نے کہلوایا کہ ان کے لیے ایک تربت ہی بنوا دی جائے، جس سے لوگوں کا شوق زیارت پورا ہو سکے، لیکن شیخ نے اسے بھی منظور نہ کیا، کچھ عرصہ کے بعد بہر حال شیخ صحتیاب ہوگئے۔

اس کے بعد سلطان الملک الکامل کو کب اور کس طرح شیخ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مذکورۂ بالا واقعہ سے شیخ کی طبیعت، ان کی مقبولیت و شہرت اور علو مرتبت کا بڑی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ امراء و سلاطین آپ کی زیارت کے مشتاق رہتے تھے، اور آپ ان سے اجتناب کرتے تھے، اور ہر کس و ناکس سے ہدایا و تحائف قبول نہ فرماتے تھے۔

عبادت و ریاضت شیخ کی زندگی فقر و فاقہ، زہد و عبادت اور تقوی و طہارت کی زندگی تھی۔ وہ اپنا وقت زیادہ تر عبادت و ریاضت میں گذارتے تھے اور کبھی کبھی اس کے لیے خاص طور اہتمام کرتے تھے، اس میں وہ چالیس[۴۰] دن تک مسلسل روزہ رکھتے اور شب بیداری کرتے تھے۔

ایک بار اسی قسم کے ایک چلہ کے آخری دنوں میں شیخ کو ہریسہ[۱] کھانے کی خواہش ہوئی، آپ نے اس خواہش کو دبانے کی پوری کوشش کی، لیکن آخر میں اس سے مغلوب ہو کر ہریسہ خریدا اور ایک قبہ میں بیٹھ کر کھانے کا ارادہ کیا، جیسے ہی لقمہ اٹھایا، ایسا محسوس ہوا کہ قبہ کی دیوار شق ہوگئی اور ایک نہایت حسین و جمیل شخص برآمد ہوا اور اس فعل پر انکو ملامت کی، شیخ نے فوراً لقمہ پھینک دیا اور اس مرتبہ تادیب نفس کے لیے بجائے چالیس[۴۰] دن کے

۱ ہریسہ: ایک قسم کا کھانا ہے جو گوشت اور کوٹے ہوئے گیہوں یا دوسرے اناج کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔

اپنے وظیفہ کو پچاس[۵۰] دن تک جاری رکھا[۱]۔

اسی طرح جب کبھی بتقاضائے بشریت کوئی لغزش سرزد ہو جاتی تو معمول سے زیادہ مجاہدہ کرتے، نفس کو پوری سزا دیتے، کبھی کبھی اس کے بعد بھی تسلی نہ ہوتی، چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ[۲] خود ان کی زبانی منقول ہے کہ ایک بار مجھ سے ایک لغزش ہوگئی، اس کی وجہ سے مجھے بڑی شدت کے ساتھ مواخذہ کا احساس ہوا، اور اس قدر افسردگی اور بے چینی طاری ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا جان نکل جائے گی، اسی حال میں حیران و پریشان نکل کھڑا ہوا اور کوہ مقطم پر چلا گیا، وہاں برابر گریہ و زاری اور توبہ و استغفار میں مصروف رہا، مگر کسی طرح طبیعت کا انقباض اور رنج و ملال دور نہ ہوا، تو شہر آیا اور جامع عمرو بن العاص میں داخل ہو گیا، وہاں بھی سرگشتہ و سرگرداں کھڑے ہو کر تضرع و استغفار میں لگ گیا، پھر بھی وہ انقباضی حالت دور نہ ہوئی، اسی اثنا میں اچانک ایک لرزہ خیز کیفیت طاری ہو گئی، پھر منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل پڑی اور زبان پر یہ شعر[۳] آ گیا:

من ذا الذی ما ساء قط — ومن له الحسنی فقط

(کون ہے جس نے کبھی کوئی برائی نہیں کی اور کس کے لیے صرف نیکی ہی نیکی ہے)

اسی عالم میں مجھے ایک آواز سنائی دی جیسے زمین اور آسمان کے درمیان سے کوئی کہہ رہا ہے:

محمد الهادی الذی — علیه جبریل هبط[۴]

(وہ محمد ہادی ہیں جن پر جبریل امین نازل ہوئے۔)

۱ مقدمہ شرح دیوان، ص ۱۰۔ ۲ مقدمہ شرح دیوان، ص ۸ ۳ اس شعر کے لیے دیکھیے مقامات الحریری، بیروت ۱۹۵۸ء، المقامۃ الثغریہ، ص ۱۸۶ ۴ ضرورت شعری کے پیش نظر محمد کو غیر منصرف اور جبریل کو منصرف پڑھا جائے گا۔

وجد وطرب شیخ اکثر اوقات سکر اور محویت کے عالم میں رہتے تھے، ریاضت و مجاہدہ کی کثرت سے طبیعت میں اس قدر انفعال پیدا ہوگیا تھا کہ ذرا سی تحریک سے وجد وطرب کی حالت طاری ہو جاتی تھی،

ایک دن جامع ازہر کے قاعۃ الخطابۃ کے دروازہ پر بیٹھے تھے۔ پاس ہی فقراء و امراء کی ایک جماعت تھی، کچھ عجمی مشائخ بھی موجود تھے، جو دنیوی ساز و سامان اور آرائش و زیبائش کی چیزوں کا ذکر کر رہے تھے، وہ جب بھی ان چیزوں کا ذکر کرکے اس کی تعریف کرتے تو شیخ نہایت بے دلی اور بے رغبتی سے فرما دیتے "ھذا من زخم العجم" (یہ سب عجمیوں کی وضعیات ہیں) وہ لوگ اسی قسم کی گفتگو کر ہی رہے تھے کہ اچانک مؤذنوں نے ایک ساتھ اذان کی آواز بلند کی، اس پر شیخ نے بڑے جذب کے ساتھ فرمایا "وھذا زخم العرب" (اور یہ ہے عرب کی وضع) یہ کہکر شیخ وجد فرمانے لگے، ان کی اس کیفیت کا اثر تمام حاضرین پر چھا گیا اور سب کے سب چیخ اٹھے[1]،

کبھی اچانک کسی تصور ہی سے شیخ وجد فرمانے لگتے تھے۔ ان کے صاحبزادے کمال الدین محمد کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار دیکھا کہ شیخ اک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور دیر تک وجد کا عالم طاری رہا، جسم سے پسینہ اس قدر بہہ رہا تھا کہ قدموں کے نیچے تک آرہا تھا، پھر بےخود ہوکر زمین پر گر پڑے، کچھ دیر کے بعد سکون ہوا تو سجدہ ادا کیا، میں نے دریافت کیا تو اپنا یہ شعر پڑھا:

وعلی تفنن واصفیہ بحسنہ   یفنی الزمان وفیہ مالم یوصف[2]

(اس کے حسن وجمال کی تعریف و توصیف کرنے والے کتنے ہی تفنن سے کام لیں، زمانہ ختم ہو جائیگا لیکن اس کے اوصاف کا بیان مکمل نہ ہو سکے گا۔)

---

[1] دیکھئے مقدمہ شرح دیوان ص ۹ [2] اس شعر کے متعلق شیخ حسن البورینی نے لکھا ہے کہ مجھے باوثوق ذریعہ سے یہ اطلاع ملی ہو کہ شیخ نے فرمایا تھا کہ اگر مدح رسول میں، اسکے سوا میرا اور کوئی شعر نہ ہوتا تو بھی کافی تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اس میں مدح رسول مقصود ہے۔ (ملاحظہ ہو شرح دیوان ج ۱ ص ۱۶۳)

پھر فرمایا کہ اس وقت اس شعر کے متعلق ایسے معانی کا الہام ہوا ہے کہ ابتک مجھے ایسا انکشاف نہیں ہوا تھا،

کبھی کبھی شاہراہ عام پر یہ کیفیت طاری ہوجاتی، ایک بار شیخ قاہرہ کے بازاروں سے گذر رہے تھے، راستہ میں ایک مقام پر کچھ پہرہ دار ناقوس بجا رہے تھے، اس کو سنتے ہی حالت دگرگوں ہوگئی اور سر بازار جھومنے لگے ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند   بآواز دولاب مستی کنند

پہرہ دار برابر ناقوس بجائے جارہے تھے، اور شیخ پر بےخودی کے عالم میں وجد طاری تھا، راہگیروں کا ایک بڑا مجمع اکٹھا ہوگیا اور ایک سماں بندھ گیا، اور بہتوں پر کیفیت طاری ہوگئی، اسی عالم میں شیخ نے اپنے کپڑے اتار کر پہرہ داروں کی طرف پھینک دیے، پھر کچھ دیر کے بعد بےخود ہوکر زمین پر گر پڑے، لوگ آپ کو جامع ازہر اٹھا لائے جہاں کئی روز تک یہ حالت طاری رہی،

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را   بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

جب افاقہ ہوا تو پہرہ داروں نے حاضر ہوکر آپ کے کپڑے سامنے رکھ دیے لیکن آپ نے ان کو واپس نہیں لیا، اور حاضرین نے آپ کے لباس کو تبرکاً پہرہ داروں سے خریدنا چاہا، اور کافی قیمت لگا دی، بعضوں نے بیچ دیا اور بعض نے بطور تبرک خود اپنے پاس رکھ چھوڑا[1]۔

جیسے جیسے شیخ کی عمر بڑھتی جاتی تھی، جذب وسکر کی کیفیت میں بھی شدت آتی جاتی تھی اور یہ کیفیت جلد جلد طاری ہوتی تھی، اور اس کی مدت بھی درازتر ہوتی تھی، جذب کی حالت میں آپ نہ کسی سے بات کرتے، نہ کسی کی بات سنتے اور نہ کسی کو دیکھتے، آنکھیں بند رہتی تھیں، کبھی کھڑے رہتے، کبھی بیٹھ جاتے، کبھی پہلو کے بل لیٹ جاتے، اور کبھی چت لیٹے رہتے تھے

---

[1] دیکھئے مقدمہ شرح دیوان ص ۹

اسی حالت میں کئی کئی دن گذر جاتے تھے، نہ کھاتے تھے نہ پیتے تھے، یونہی بے حس وحرکت پڑے رہتے تھے۔

ایک بار شیخ مسجد مشعتی کو تشریف لے جارہے تھے[1]، راستہ میں ایک دھوبی کپڑے دھورہا تھا، وہ کپڑوں کو پتھر پر مارتا تھا اور یہ شعر پڑھتا جاتا تھا۔

قطع قلبی هذا المقطع ۔۔۔ ماکان یصفو أو یتقطع

(میرے دل کو اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کردے، کیونکہ یہ صاف ہونے والا نہیں، تا آنکہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے)

یہ شعر سنکر شیخ کو وجد آگیا، اس کو دہرانے اور زمین پر گرکر لوٹنے لگے، تھوڑی دیر کیلئے سکون ہوجاتا تو انکو معلوم ہوتا کہ روح جسم سے پرواز کرگئی، پھر کچھ افاقہ ہوتا تو کلام لدنی فرمانے لگتے، اس کے بعد پھر مغلوب ہوجاتے اور وہی کیفیت پھر طاری ہوجاتی، اسی اثنا میں آپکے ایک ساتھی آگئے، انھوں نے یہ حال دیکھا تو یہ شعر پڑھا ؎

أموت اذا ذکرتك ثم احیا ۔۔۔ فکم أحیا علیك وکم أموت

(میں جب تجھے یاد کرتا ہوں تو مرجاتا ہوں، اس کے بعد پھر زندہ کردیا جاتا ہوں۔ بس میں کب تک اسی طرح مرتا اور جیتا رہوں گا۔)

خواجہ میر درد کا یہ شعر بھی کس قدر حسب حال ہے:

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ۔۔۔ ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

شیخ اچھل پڑے اور ساتھی سے بغلگیر ہوئے اور بڑے جذب کے ساتھ ان سے فرمایا کہ پھر پڑھو، وہ خاموش رہے، ان کو شیخ کے حال پر ترس آرہا تھا۔ جذب کے وقت شیخ کی جو حالت ہوجاتی تھی اس کو ان سے بیان کرکے درخواست کی کہ صبر و ضبط سے کام لیا کیجیے، شیخ نے جواب میں

---

[1] دیکھئے مقدمہ شرح دیوان ص ۱۱

یہ شعر پڑھا:

ان ختم اللہ بغفرانه ۔۔۔ فکل مالاقیته سهل

(اگر اللہ تعالیٰ خاتمہ بخیر فرمائے تو ہر مصیبت جس سے میں دوچار ہورہا ہوں آسان ہے۔)

یہ واقعہ وفات سے تھوڑے ہی عرصہ قبل کا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس بار جو کیفیت طاری ہوئی وہ مرتے دم تک قائم رہی اور جان لیکر گئی۔

وفات | مرض الموت اور وفات سے متعلق تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا، صرف اتنا ملتا ہے کہ جامع ازہر کے قاعۃ الخطابۃ ہی میں جمادی الاولیٰ کی دوسری تاریخ ۶۳۲ھ کو آپ داعیٔ اجل کو لبیک کہا[1] اور دوسرے دن قرافہ[2] میں عارض نامی ایک مسجد کے نیچے دفن ہوئے جو کوہ مقطم کے دامن میں ہے، جیسا کہ ابو الحسن الجزار کے ان اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے ؎

لم یبق صیب مزنة الا وقد ۔۔۔ وجبت علیه زیارة ابن الفارض

لا غروان یسقی ثراه و قبره ۔۔۔ باق لیوم العرض تحت العارض

(ہر برسنے والے بادل پر ابن الفارض کی زیارت واجب ہے، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کی مٹی سیراب ہوتی رہے، جبکہ ان کی قبر عارض کے نیچے قیامت تک کے لیے باقی ہے۔)

اس سلسلے میں شیخ کے نواسے علی کا بھی ایک شعر قابل ملاحظہ ہے:

جز بالقرافة تحت ذیل العارض ۔۔۔ وقل السلام علیك یا ابن الفارض

(قرافہ میں عارض کے دامن کے نیچے جا اور یہ کہہ "اے ابن الفارض! تم پر خدا کی رحمت ہو")

(باقی)

---

[1] النجوم الزاہرہ لابن تغری بردی، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۶ء ج ۶ ص ۲۸۸ [2] قرافہ کوہ مقطم کے دامن میں ایک وسیع قبرستان ہے جہاں صلحا و اکابر کے مزارات بھی ہیں۔ دیکھئے: صبح الاعشیٰ للقلقشندی ج ۳ ص ۳۴۴ اور معجم البلدان للیاقوت ج ۴ ص ۳۱۷

اسلامی ہند کی علمی خودداری

الدرۃ الثمینہ لملا عبدالحکیم سیالکوٹی

اور

شاہجہاں اور نواب سعداللہ خاں

از

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم، اے، ایل، ایل، بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش

(سلسلے کیلئے دیکھئے معارف ماہ ستمبر ۱۹۶۷ء)

ب۔ الدرۃ الثمینہ کا علمی پس منظر

[دیکھئے محلات نظریہ سے شمارہ (۳) و (۱۴)]

فاضل مقالہ نویس نے لکھا تھا:۔

"رسالہ میں علم باری تعالیٰ اور بحث قدم عالم کو نہایت خوبی سے لکھا ہے"۔

آگے چل کر پھر فرمایا تھا:۔

"وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے (تہافت الفلاسفہ میں) مسئلہ قدم عالم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے سبب سے شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے"۔

مگر ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نویس نے نہ تو رسالہ "الدرۃ الثمینہ" کو بالاستیعاب مطالعہ فرمانے کی زحمت کی تھی اور نہ اس کے علمی ذکری پس منظر ہی کو درخور اعتنا سمجھا۔

جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے، خود علامی سعد اللہ خاں کے مکتوب میں اسکی صراحت گذر چکی ہے، انھوں نے فرمایا تھا:۔

"خلیفہ سلطان ...... پرسید کہ امام غزالی در مسئلۂ قدم عالم و نفی علم واجب تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جہلاً مرکباً، بجزئیات مادیہ و نفی حشر اجساد تکفیر ابو نصر فارابی و شیخ بو علی سینا نمودہ ...... الخ

خود علامہ سیالکوٹی نے "علم باری تعالیٰ" کی تفصیلی بحث کے بعد امام غزالی کے حوالے سے لکھا ہے:۔

قال الامام حجۃ الاسلام فی	امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنے کسی رسالہ میں
بعض رسائلہ عن مجموع ما غلط	لکھا ہے کہ فلاسفہ کی جملہ غلط کاریاں ان کی
الفلاسفۃ فیہ یرجع الی عشرین	بیس اصلوں کا نتیجہ ہیں، ان میں سے تین
اصلاً یجب تکفیرہم فی ثلثۃ	مسئلوں کے اندر ان کی تکفیر واجب ہے۔
منہا ...... من ذلک قولہم ان	...... ان میں سے پہلا تو ان کا یہ قول ہے کہ
الاجسام لا یحشر وان المثاب	اجسام مرنے پیچھے اٹھائے نہ جائیں گے اور کہ
والمعاقب ہی الارواح المجردۃ	جس کو ثواب یا عذاب ہوگا وہ صرف
...... ومن ذلک قولہم ان اللہ تعالیٰ	ارواح مجردہ ہیں ...... اور ان میں سے دوسرا انکا
یعلم الکلیات دون الجزئیات	یہ قول ہے کہ باری تعالیٰ کو صرف کلیات کا
وہذا ایضاً کفر صریح	علم ہوتا ہے نہ کہ جزئیات کا اور یہ صریح کفر ہے ......

ومن ذلك قولهم بقدم العالم وان لیته۔"

اور ان میں سے تیسرا ان کا قدم عالم اور اس کی ازلیت کا قول ہے۔

لیکن فاضل مقالہ نویس نے دونوں مرتبہ ان میں سے "حشر اجساد" کے مبحث کو چھوڑ دیا ہے، حالانکہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے اسے اتنی اہمیت دی ہے کہ "قدم عالم" کے مبحث سے پہلے اس کا ذکر کرکے اس کے قائلین کی تکفیر کی ہے، فرماتے ہیں:-

اقول تکفیرهم بانکار الحشر الجسمانی حق لانه لما نطق به الکلام المجید... قال الامام الرازی لا یمکن الجمع بین الایمان... وانکار الحشر الجسمانی... وفی شرح المواقف: واما وقوع الحشر الجسمانی فلان الصادق الذی علم صدقه قاطبة خبر عنه فی مواضع... حتی صار معلوماً بالضرورة کونه من الدین القویم... فمن اراد تاویلها... فقد کابر بانکار ما هو من ضروریات ذلك الدین۔"

میں کہتا ہوں کہ حشر جسمانی کے انکار کی بنا پر فلاسفہ کی تکفیر بالکل درست ہے کیونکہ یہ (حشر جسمانی) ان تعلیمات میں سے ہے جنکی قرآن نے صاف صاف تصریح کی ہے،.... امام رازی نے کہا ہے کہ ایمان.... اور حشر جسمانی کے انکار کے درمیان تطبیق نہیں ہو سکتی (حشر جسمانی کے انکار کے بعد ایمان باقی نہیں رہتا)... اور "شرح مواقف" میں ہے: رہا حشر جسمانی کا واقع ہونا تو چونکہ جس راست گو ہستی کی راست بیانی پورے حزم و یقین کے ساتھ معلوم ہے، اس نے اس کی کئی جگہ خبر دی ہے... یہاں تک کہ اس کا دین قویم میں سے ہونا یقینی ہو گیا... پس جس شخص نے اسکی تاویل کی کوشش کا ارادہ کیا... تو اس نے ان چیزوں کے انکار کے ساتھ کفر کیا جو دین کی ضروریات میں سے ہیں۔

علامہ سیالکوٹی کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ انھوں نے "الدرة الثمینة" میں "علم باری تعالیٰ" اور "مبحث قدم عالم" کے علاوہ "حشر اجساد" کے مسئلہ کی بھی باحسن وجوہ توضیح کی تھی پھر فاضل مقالہ نویس نے علامی سعد اللہ خاں کے مکتوب کو بھی ذمہ داری سے ساتھ نہیں پڑھا جس کی بنا پر اس اہم مسئلہ کو نظر انداز کر دیا۔

جہانتک ثانی الذکر (مسائل ثلثہ کے علمی و فکری پس منظر) کا تعلق ہے، اس کے لیے علم کلام کی تاریخ بالخصوص اس فن میں امام غزالی کی مساعی علمیہ پر نظر ڈالنا ضروری ہے، اس غرض سے اس کا ایک اجمالی جائزہ دیا جاتا ہے۔

علم کلام کی ماہیت اور موضوع "شرح مواقف" میں علم کلام کی تعریف یہ کی گئی ہے:-

الکلام علم باموریقتدر معه اثبات العقائد الدینیة بایراد الحجج ودفع الشبهة"۔ (شرح المواقف، الموقف اول۔ مرصد اول مقصد اول)

علم کلام وہ علم ہے جس کے ذریعہ عقائد دینیہ کے ثابت کرنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے، اس طرح کہ ان کے ثبوت میں دلائل لائے جائیں اور ان پر جو شبہات وارد ہوتے ہیں ان کو دفع کیا جائے۔

اس طرح علم کلام ایک بہت ہی وسیع علم ہے، جس میں امہات عقائد اسلامیہ یعنی توحید باری تعالیٰ نبوت محمدی اور حشر اجساد جیسے اہم مسائل کے اثبات سے لیکر فروعی اور ثانوی اہمیت کے اختلافات تک داخل ہیں،

مگر "الدرة الثمینة" ان تمام مسائل بلکہ جملہ امہات عقائد کے اثبات پر بھی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں صرف تین اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے، یعنی

(الف) نفی قدم عالم

(ب) اثبات حشر اجساد، اور

(ج) شمول علم باری تعالیٰ بجزئیات مادیہ۔

مگر ایسا کیوں ہے؟ اس کی ایک طویل تاریخ ہے، ذیل میں اس کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

علم کلام کا آغاز اسلام ابتداً عرب میں مبعوث ہوا، جس کے "سوز دروں" نے اس کی فطری، معقول، انسان دوست اور منصفانہ تعلیمات کا انتہائی خلوص کے ساتھ خیر مقدم کیا، لیکن جب اس کا واسطہ "عجم کے حسن طبیعت" سے پڑا تو پھر اسے ان تعلیمات کو عقل کی کسوٹی پر کس کر پیش کرنے کی ضرورت ناگزیر ہوگئی، یہی فکری سرگرمی (اسلامی تعلیمات کی عقلی توجیہ) "علم کلام" کے نام سے موسوم ہوئی، اس کے قدیم ترین نمایندے جنھوں نے ایک منظم علم کی حیثیت سے اس کی (اصطلاحی علم کلام کی) تدوین کی معتزلہ (معتزلہ ثالثہ) تھے جن کا بانی واصل بن عطاء الغزال کو قرار دیا جاتا ہے۔

ابتدا میں یہ قیل وقال اور اس سے متعلقہ فکری سرگرمی صرف مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان تک محدود تھی، جن میں اسلام کی اصولی تعلیمات متفق علیہ تھیں۔

علم کلام کا یہ دور "کلام المتقدمین" کہلاتا ہے۔

دوسری صدی ہجری کے ربع ثانی میں سیاسی انقلاب کے ساتھ ثقافتی اور فکری انقلاب بھی رونما ہوا، امویوں کے بجائے عباسی خاندان عجمیوں کی مدد سے برسر اقتدار آیا (۱۳۲ھ) عباسیوں کی تخت نشینی گویا خسرو نوشیرواں کا احیا تھی، علم حکمت کی سرپرستی کے نام سے مختلف اقوام کے ذہنی و فکری سرمایہ کو عربی میں منتقل کیا گیا، ان میں سب سے اہم یونانی فلسفہ تھا، جس سے اسلامی تعلیمات کا تصادم ہوا اور اس کے نتیجے میں قیل وقال اور فکری

سرگرمیوں کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، اور اس کے حیطۂ عمل میں خود اسلام کی بنیادی تعلیمات یعنی توحید باری، نبوت محمدی اور ایمان بالآخرۃ بھی آگئے۔

اب مفکرین اسلام کی فکری سرگرمیاں "کلام باری" اور "جبر و اختیار" کے مسائل سے آگے بڑھ کر توحید باری تعالیٰ، نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعثت بعد الموت کے عقلی دلائل تک پہنچ گئیں۔

علم کلام کا یہ دور "کلام المتاخرین" کہلاتا ہے، چنانچہ علامہ سعد الدین تفتازانی نے شرح عقائد نسفی کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

لما نقلت الفلسفة عن اليونانية	پھر جب فلسفہ یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوا
الی العربية وخاض فيها الاسلاميون	اور مسلمانوں نے اس میں غور و خوض کیا
وحاولوا الرد على الفلاسفة	اور جن امور میں فلسفہ نے شریعت کی
فيما خالفوا فيه الشريعة	مخالفت کی تھی، اس کی تردید کا ارادہ کیا
فخلطوا بالكلام كثيراً من الفلسفه	تو کلام میں فلسفہ کے بہت سے مسائل ملا دیے
ليتحققوا مقاصدها فيتمكنوا	تاکہ ان کی تحقیق کر سکیں اور ان کے
من ابطالها (شرح عقائد نسفی ص۳)	ابطال پر قادر ہو سکیں۔

لیکن بات یہیں تک محدود نہیں رہی، بلکہ جب مفکرین اسلام کو دیگر ادیان کے متبعین بالخصوص فلسفہ کے پیروؤں سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا تو قدیم مسیحی معتذرین (Apologists) کی طرح انھوں نے دو موقف اختیار کیے:۔

بعض لوگوں نے ان مسائل کو جو اسلام کی تعلیمات سے متصادم تھے، باطل کرنے کی کوشش کی، یہ لوگ "متکلمین" تھے، اور ان کی فکری سرگرمیاں "علم کلام" (یا کلام متاخرین) کہلاتی ہیں۔

لیکن کچھ لوگوں نے فلسفہ کی دلکشی سے مسحور ہو کر یونانی فلسفہ کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تاویل و توجیہ پر اصرار کیا، یہ لوگ "فلاسفۂ اسلام" یا "حکمائے اسلام" کہلائے۔

اس کے بعد فطری تھا کہ ان دونوں تحریکوں کے نمائندوں میں ایک مسلسل فکری نزاع کا سلسلہ قائم ہو، یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا، اسلام کی فکری ثروت اسی کشمکش کی رہین منت ہے۔

علم کلام کا ارتقاء اس کشمکش کا آغاز عباسیوں کے آغاز اقتدار سے ہوتا ہے، عباسی چونکہ عجمیوں کی مدد سے برسر اقتدار آئے تھے، اس لیے نئے حکمرانوں نے ان کے معاملے میں زیادہ نرم پالیسی اختیار کی، مگر اس رواداری سے غلط فائدہ اٹھایا گیا، اور یکایک اسلام دشمن تحریکیں حرکت میں آگئیں، ان تحریکوں کا مقصد عربوں کی حکومت اور اسلام کی دینی تعلیمات کا استیصال کرکے ساسانیوں کی حکومت اور مجوسی مذہب کا احیاء تھا۔

پہلے اور دوسرے عباسی خلیفہ سفاح اور منصور کا زمانہ زیادہ تر انقلابی سرگرمیوں کی بیخ کنی اور اپنے علوی حریفوں کے استیصال میں گزرا، مگر تیسرے خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ - ۱۶۹ھ) کو نہ صرف اس بڑھتے ہوئے خطرہ کا احساس ہوا، بلکہ اسے اس کے تدارک کے لیے بھی ضروری فراغت مل گئی، چنانچہ ایک طرف اس نے ان مفسدہ پردازوں کے استیصال کیلئے ایک خصوصی پولس افسر "صاحب الزنادقہ" کے نام سے مقرر کیا، دوسری طرف ان کے اصولی نظریات کی بیخ کنی کے لیے علماء و فضلاء کو مامور کیا۔ ان علماء و فضلاء میں سے جو جماعت اس کڑی کمان کو زہ کر سکتی تھی، وہ متکلمین کی جماعت تھی، مسعودی نے لکھا ہے:

وکان المھدی اول من امر الجدلیین من اھل البحث

اور مہدی نے سب سے پہلے طبقۂ متکلمین میں سے مناظروں کو بلا کر ملاحدہ اور

من المتکلمین بتصنیف الکتب فی الرد علی الملحدین ممن ذکرنا من الجاحدین وغیرھم واقاموا البراھین علی المعاندین وازالوا شبه الملحدین واوضحوا الحق للشاکین [ابن الاثیر مصری ج ۲ ص [illegible]]

(مروج الذہب ومعدن الجواہر برحاشیۂ کامل)

دیگر مخالفین کے رد میں کتابیں لکھوائیں، انھوں نے (متکلمین نے) مخالفین کے مقابلے میں دلائل قائم کیے، ملاحدہ کے شبہات کا ازالہ کیا اور متشککین کے واسطے حق کو واضح کیا۔

اس اہم فریضہ کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان متکلمین نے جو بالعموم فرقۂ معتزلہ سے تعلق رکھتے تھے، باقاعدہ فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا، شہرستانی نے لکھا ہے:

ثم طالع بعد ذلک شیوخ المعتزلۃ کتب الفلاسفۃ حین فسرت ایام المامون فخلطت مناھجھا بمناھج الکلام ..... وکان ابو الھذیل العلاف شیخھم الاکبر وافق الفلاسفۃ ..... ثم ابراھیم بن سیار النظام فی ایام المعتصم کان اغلی فی تقریر مذاھب الفلاسفۃ ..... ثم ظھرت بدع بشر بن المعتمر من القول بالتولد والافراط فیه والمیل الی الطبیعیین

اس کے بعد فلسفہ کی کتابیں مامون الرشید کے زمانہ میں ترجمہ ہوئیں تو مشاہیر معتزلہ نے ان کا مطالعہ کیا، اور اس طرح فلسفہ کے مناہج کو علم کلام کے مناہج کے ساتھ خلط ملط کر دیا ..... چنانچہ ابو الہذیل العلاف جو ان کا مشہور عالم تھا، فلاسفہ کا ہم زبان تھا ..... پھر ابراہیم بن سیار النظام جو معتصم باللہ (۲۱۸ھ - ۲۲۷ھ) کے زمانہ میں تھا، اور مذاہب فلسفہ کی تقریر میں دستگاہ عالی رکھتا تھا ..... پھر بشر بن المعتمر کی بدعتوں کا

من الفلاسفة (الملل والنحل شہرستانی جلد اول ص ۷۰)

زمانہ آیا جو تولید (علت ثانیہ) کا قائل تھا، بلکہ اس میں مبالغہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ فلاسفہ میں سے گروہ طبیعیین کی جانب میلان رکھتا تھا۔

اس طرح متکلمین کی فکری مساعی سے فلسفہ کے رد و ابطال کا بڑا وافر لٹریچر ظہور میں آیا، اس ضمن میں مندرجۂ ذیل متکلمین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:۔

النوبختی : کتاب الآرا والدیانات

ہشام بن الحکم : کتاب علی ارسطا طالیس فی التوحید، کتاب الدلالات علی حدث الاشیاء اور کتاب الرد علی اصحاب الطبائع،

ابو ہاشم الجبائی : کتاب التصفح، کتاب النقض علی ارسطا طالیس فی الکون والفساد، کتاب الطبائع والنقض علی القائلین بہا۔

مگر سب سے اہم شخصیت امام ابوالحسن الاشعری کی تھی جو پہلے معتزلی تھے اور ابو ہاشم الجبائی کے باپ ابو علی الجبائی کے شاگرد رشید تھے، پھر تائب ہو کر اہل السنت والجماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ معتزلہ کے رد کے علاوہ انھوں نے فلاسفہ کے رد میں بھی متعدد کتابیں لکھیں، جیسے:

کتاب علی اہل المنطق

کتاب الفنون فی الرد علی الملحدین

الاستقصاء لجمیع اعتراض الدھریین وسائر اصناف الملحدین

کتاب علی الدھریین فی اعتلالاتہم فی قدم الاجسام،

کتاب عن اعتلال من زعم ان الموات یفعل بطبعہ ونقضنا علیہم اعتلالاتہم واوضحنا تموبہہا،

کتاب الفصول فی الرد علی الملحدین والخارجین عن الملة کالفلاسفة والطبائعیین والدہریین واہل التشبیہ والقائلین بقدم الدھر،

کتاب فی الرد علی الفلاسفة ... نقض علل ابن قیس الدھری،

الکلام علی القائلین بالہیولیٰ والطبائع،

نقض علل ارسطا طالیس فی السماء والعالم۔

نقض کتاب آثار العلویہ علی ارسطا طالیس۔

امام اشعری کے بعد ان کے متبعین نے بھی معتزلہ اور دوسرے بدعتی فرقوں کی اصلاح کے ساتھ فلاسفہ کی فکری بے راہ رویوں پر احتساب و انتقاد اور تردید و ابطال کا سلسلہ جاری رکھا، امام اشعری کے تلامذہ میں ابوالحسن الباہلی اور ابن مجاہد الطائی خصوصیت سے مشہور تھے، ان دونوں بزرگوں کے شاگردوں میں تین فاضلوں نے شہرت حاصل کی: قاضی ابوبکر الباقلانی، ابو اسحٰق الاسفرائنی اور ابن فورک، ان میں قاضی ابوبکر الباقلانی، المتوفی ۴۰۳ھ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ "اعجاز القرآن" کے علاوہ ان کی "کتاب التمہید" بھی چھپ گئی ہے جس کا بڑا حصہ فلاسفہ اور دیگر ملاحدہ کے رد و ابطال پر مشتمل ہے،

امام غزالی اور تہافت الفلاسفہ لیکن فلسفہ کی تردید و ابطال میں خصوصیت کا شرف امام غزالی کی "تہافت الفلاسفہ" کو حاصل ہے۔ یوں بھی امام صاحب کی شخصیت اسلامی فکر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، وہ امام الحرمین (مصنف "کتاب الشامل فی علم الکلام") کے شاگرد رشید تھے، اس زمانہ میں منطق و فلسفہ کا رواج عام ہو گیا تھا اور کلام و فلسفہ میں خلط ملط ہونے لگا تھا، اس لیے ضرورت سمجھی گئی کہ جہاں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا فلسفہ

سے تصادم ہوتا ہو وہاں اس کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، اس نئے انداز بحث کا آغاز امام غزالی نے کیا، ابن خلدون لکھتا ہے:۔

واول من كتب فى طريقة الكلام على هذا المنهج الغزالى رحمه الله وتبعه الامام ابن الخطيب وجماعة وقفوا اثرهم واعتمدوا تقليدهم (مقدمہ ابن خلدون)

سب سے پہلے اس انداز پر علم کلام میں امام غزالی نے لکھا، پھر امام رازی اور دوسرے لوگوں نے ان کی تقلید کی اور ان کے نقش قدم پر چلے اور ان کی تقلید پر اعتماد کیا۔

امام صاحب نے فلسفہ کے ابطال سے پہلے بڑی سنجیدگی اور ذمہ داری سے اس کا مطالعہ کیا اور اس کی تعلیمات کو "مقاصد الفلاسفہ" کے نام سے مرتب کیا، اس کے بعد فلاسفہ کے موقف کو دیانتداری کے ساتھ متعین کرنے کی کوشش کی، اور اس کے لیے ارسطو کی تعلیمات کو منتخب کیا۔ چنانچہ "تہافۃ الفلاسفہ" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

ليعلم ان الخوض فى حكاية اختلافات الفلاسفة تطويل فان خبطهم طويل ونزاعهم كثير وآراءهم منتشرة وطرقهم متباعدة متدابرة۔ فلنقتصر على اظهار التناقض فى رأى مقدمهم الذى هو الفيلسوف المطلق والمعلم الاول فانه رتب علومهم وهذبها بزعمهم وحذف الحشو من آرائهم وانتقى ما هو الاقرب الى اصول اهوائهم وهو ارسطاطاليس (تہافۃ الفلاسفہ للامام غزالی مطبوعہ مطبعہ خیریہ ج اول ص ۳)

جاننا چاہیے کہ فلاسفہ کے اختلافات میں غور و خوض تطویل لاطائل ہے کیونکہ ان کا تخبط طویل ہے، انکی نزاعیں کثیر ہیں انکے آراء و مذاہب میں پراگندگی ہے، ان کے مناہج بحث ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ لہذا ہم ان کے پیشوا کی رایوں میں جو تناقض ہے، اسی کے اظہار پر اکتفا کریںگے۔ یہ پیشوا ارسطو ہے جو فلسفی علی الاطلاق اور معلم اول ہے، اسی نے ان کے علوم کو مرتب کیا اور انکے گمان میں انھیں منقح کیا تھا، اور حشو و زوائد کو حذف کر کے ان کے اصولی دعوؤں و مظنونات کو منتخب کیا تھا، اور وہ ارسطو ہے۔

لیکن خود ارسطو کے کلام کی توجیہ و تاویل میں اس کے تلامذہ و متبعین کے درمیان شدید اختلاف تھا، اور سریانی اور اس کے بعد عربی میں اس کی تصانیف کا ترجمہ ہونے کے بعد یہ اختلاف اور بڑھ گیا تھا، اس لیے امام غزالی نے ارسطاطالیسی فلسفہ کے نقد و تردید کے لیے اس کی ان ہی تعبیرات کو منتخب کیا جو ابو نصر فارابی اور شیخ بو علی سینا سے منقول تھیں، چنانچہ آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

ثم المترجمون لكلام ارسطاطاليس لم ينفك كلامهم عن تحريف وتبديل محوج الى تفسير وتاويل حتى اثار ذلك ايضا نزاعا بينهم واقومهم بالنقل والتحقيق من المتفلسفة الاسلامية الفارابى ابو نصر وابن سينا۔ فلنقتصر على ابطال

پھر جن لوگوں نے ارسطو کی تصانیف کا ترجمہ کیا ہے، ان کا کلام بھی تحریف و تبدیلات سے خالی نہیں ہے، اس لیے بجائے خود تاویل و توجیہ کا محتاج رہا ہے، اس اختلاف تعبیر کی وجہ سے ارسطو کی مراد متعین کرنے کے بارہ میں اسکے متبعین کے درمیان بڑی نزاعیں پائی جاتی ہیں، فلاسفہ اسلام میں اقوال ارسطو کے نقل و تحقیق کے باب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد

ما اختاراہ ورأیاہ الصحیح من مذاہب
رؤسائھم فی الضلال فان
ما ھجراہ واستنکفاہ من المتابعۃ
فیہ لا یتماری فی اختلالہ ولا
یفتقر الی نظر طویل فی ابطالہ
فلیعلم انا مقتصرون علی رد مذاہبھم
بحسب نقل ہذین الرجلین
(تہافت الفلاسفۃ للامام غزالی
ج اول ص ۳-۴)

ابو نصر فارابی اور ابن سینا کی تصانیف
ہیں، اسلئے مجوزہ ابطال و تردید کی کوشش
میں ہم اسی چیز پر انحصار کرینگے جسے اپنے
گمراہ رؤساء مذاہب کے اقوال میں سے ان دونوں
نے اختیار کیا ہے اور صحیح سمجھا ہے کیونکہ جس
چیز کو ان دونوں نے چھوڑ دیا اور جس کی
پیروی سے انھوں نے بے اعتنائی برتی ہے
اس کے مختل و مشکوک ہونے میں کوئی شک
نہیں ہے اور نہ اس کے ابطال کے لیے
کسی غور و فکر کی ضرورت ہے، پس جاننا
چاہیے کہ مذاہب فلسفہ کے رد کے بارہ میں
ہم ان ہی دونوں فلسفیوں کی نقل پر اکتفا کرینگے

اس کے بعد انھوں نے ان مسائل پر تنقیدی نظر ڈالی ہے چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" کے مقدمہ کے بعد انھوں نے ان بیس مسائل کو درج کیا جن کے اندر فلسفہ اور شریعت کے درمیان تصادم ہوتا ہے۔

ان مسائل بست گانہ کی تفصیل غیر ضروری ہے، مگر سوال یہ ہے کہ آیا یہ تمام بنیادی اختلافات ہیں جن کی بنا پر فلاسفہ کی تکفیر واجب ہو، یا صرف بعض اساسی طور پر منافی اسلام ہیں، اس کا جواب امام صاحب نے کتاب کے خاتمہ میں یہ دیا ہے:-

فان قال قائل قد فصلتم
مذاہب ھؤلاء، افتقطعون

پس اگر کوئی کہنے والا کہے کہ تم نے فلاسفہ کے
مذہب کی تفصیل تو بیان کر دی، پھر بھی

بکفرھم ووجوب القتل لمن یعتقد
اعتقادھم، قلنا تکفیرھم لابد منہ
فی ثلاث مسائل:-
احدھا مسئلۃ قدم العالم
وقولھم ان الجواہر کلھا قدیمۃ
والثانیۃ قولھم ان اللہ تعالیٰ
لا یحیط علما بالجزئیات الحادثۃ
من الاشخاص والثالثۃ فی
انکار بعث الاجساد وحشرھا۔
فھذہ المسائل الثلاث لا تلائم
الاسلام بوجہ ومعتقدھا
معتقد کذب الانبیاء.....
وھذا ھو الکفر الصریح الذی
لم یعتقدہ احد من فرق
المسلمین (تہافت الفلاسفہ امام غزالی ج اول ص ۹۰-۹۱)

تو بتاؤ کہ آیا تم قطعیت کے ساتھ انکی تکفیر
نیز اس بات کے قائل ہو کہ جو ان کے
معتقدات پر اعتقاد رکھتا ہو، وہ واجب القتل
ہے، تو اس کے جواب میں ہمارا کہنا ہے کہ
تین مسئلوں میں ان کی تکفیر ناگزیر ہے:-
اول: قدم عالم کا قول اور فلاسفہ کا یہ کہنا
کہ جواہر سب کے سب قدیم ہیں
دوم: فلاسفہ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ
کا علم جزئیات حادثہ پر محیط نہیں ہے،
سوم: فلاسفہ کا بعث بعد الموت
اور حشر اجساد کا انکار
یہ تین مسئلے کسی طرح بھی اسلام کے ساتھ ہم آہنگ
نہیں ہوسکتے اور انکا اعتقاد رکھنے والا
انبیاء علیہم السلام کے جھوٹا ہونے کا معتقد ہے.....
جو صریح کفر ہے، اور جس پر اسلامی فرقوں
میں سے کسی فرقہ کا اعتقاد نہیں ہے۔

امام غزالی اور فارابی و ابن سینا کی بالواسطہ تکفیر

عام طور پر مشہور ہے کہ امام غزالیؒ نے مسائل ثلثہ (قدم عالم، انکار علم باری بجزئیات مادیہ اور انکار حشر جسمانی) کی بنا پر

فارابی اور بوعلی سینا کی تکفیر کی ہے، چنانچہ حسب مکتوب سعد اللہ خاں علامی بنام علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی وزیراعظم ایران نے ہندوستانی سفارت خانہ کے ملازمین محب علی اور محمد فاروق سے کہا تھا:-

"امام غزالی در مسئلۂ قدم عالم ونفی علم واجب تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جلالاً کبیراً)

بجزئیات مادیہ ونفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی وشیخ ابوعلی سینا نمودہ"

(تذکرہ باغستان امام الدین ریاضی ورق ۶۸۶)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب نے ان دونوں کی براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ تکفیر کی ہے، انھوں نے پہلے تو یہ کہا کہ یونانی فلسفہ کا ممثل اعظم ارسطو ہے، اور ارسطو کے قابل اعتماد شارح اور ترجمان ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا ہیں اور یہ جن مسائل کی ارسطو کی جانب سے تعلیم دیتے ہیں، ان میں یہ مسائل ثلاثہ بھی ہیں چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" میں ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں:-

المسئلۃ الاولیٰ فی ابطال مذہبہم فی ازلیۃ العالم — (۱) ازلیت عالم کا ابطال۔

المسئلۃ الثانیۃ فی ابطال مذہبہم فی ابدیۃ العالم — (۲) ابدیت عالم کا ابطال

الثالثۃ عشرۃ فی ابطال قولہم ان الاول لایعلم الجزئیات — (۱۳) فلاسفہ کے اس قول کا ابطال کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کو نہیں جانتا۔

العشرون فی ابطال انکارہم البعث وحشر الاجساد — (۲۰) فلاسفہ جو حشر اجساد کے منکر ہیں، انکا ابطال

اور یہ تینوں مسائل متفقہ طور پر کفر صریح ہیں، اسلیے انکے قائلین (فارابی اور ابن سینا) واجب التکفیر ہیں، امام صاحب نے ان دونوں کی کتابوں کے مصرح طور پر حوالے نہیں دیے ہیں، مگر انکی تصانیف کے مطالعہ کے بعد واضح ہوجاتا ہے کہ امام غزالی کی یہ گرفت غلط نہیں تھی۔

(باقی)

ہندوستان کی عربی شاعری میں جغرافیائی و تہذیبی اثرات

از جناب حامد علی خاں صاحب رام پور

(۳)

عطا بن یعقوب بن ناکل غزنوی نے چنبیلی کی ہجو ملیح لکھی ہے[۱]

الیک الیاسمین الغض عنی — الیک، فان فیہ شر فال

فنصف منہ یاس من وصال — ونصف منہ مین من خیال

تر و تازہ چنبیلی کے پھول کو اپنے پاس ہی رکھئے، مجھے اسکی ضرورت نہیں، اس میں بدشگونی ہے یاسمین کے دو حصوں 'یاس' اور 'مین' ہیں سے پہلا حصہ 'یاس' معشوق کے وصال سے ایوسی پر غمازی کرتا ہے اور اسکا دوسرا حصہ 'مین' خیال کے کذب پر دلالت کرتا ہے۔

شیخ احمد شروانی نے کٹھل، شریفہ اور اناناس کے اوصاف بیان کیے ہیں، جو ترتیب وار درج ذیل ہیں۔

انطلب من ثمار الہند نوعا — نیوب عن الدواء لکل داء[۲]

خذ الاکتال، واضرب عن سواھا — فکل الصید فی جوف الفراء

---

[۱] لباب الالباب: ص ۲، [۲] ثقافۃ الہند جلد پنجم عدد اول: ص ۹۱

ترجمہ: اے مخاطب! کیا تو ہندستان کے پھلوں میں سے اس قسم کے پھل کا خواہاں ہو جو ہر بیماری کی دوا کا قائم مقام ہو؟ کٹھل لے لے اور دوسرے پھلوں کو چھوڑ کیونکہ سارے شکار گورخر کے پیٹ میں ہیں۔ عربی زبان کی مشہور مثل ہے کل الصید فی جوف الفراء۔ یعنی مختلف جانوروں کے شکار کرنے کی زحمت برداشت کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ایک گورخر کا شکار کرلیا جائے جو نتیجے کے لحاظ سے سب پر حاوی ہوگا۔ یہ مثل اس موقع پر بولی جاتی ہے جب ایک خاص کام کرلینے سے بہت سے کام نکل جائیں۔

تمتع بالشریفة یا حبیبی — وقابلها بتشریف ولطف [۱]

الم تر ما بها من طیبات — تروق الذ أنقین جنا اللطائف [۲]

میرے دوست! شریفہ سے لطف اندوز ہو، اور اس کے ساتھ عزت اور نرمی سے پیش آ۔ کیا تجھے شریفے کی خوبیوں کا علم نہیں؟ وہ کھانے والوں کو لطیفوں کا سا مزہ دیتا ہے۔

قلبی الشجی یقول: لست بناس — یا ابن الکرام! محاسن الخناس [۲]

من طیبه یشفی العلیل من الجوی — وهو الدواء لصاحب الوسواس

کم من عیون حدقت بجماله — لتصون ذالك من عیون الناس

والناس من اشواقهم وغرامهم — یتطلعون الیه، وهو یقاسی

کربا من الخوف المصفر لونه — ولعله بتشویش الحراس

فالله یحمی روضة یبدو بها — هذا الجمیل الطیب الانفاس

اے محترم! میرا غمگین دل کہہ رہا ہے کہ آپ اناس کی خوبیاں نہیں بھولے ہوں گے۔ اسکی خوشبو سے بیمار عشق کو شفا ہوتی ہے اور وہ وسواس کے مریض کی دوا ہے۔ بہت سی

---

[۱] ثقافة الهند جلد پنجم عدد اول: ص ۹۲ [۲] ایضاً ص ۹۲

آنکھوں نے اس کے حسن وجمال کو گھیر رکھا ہے، تاکہ اس کو لوگوں کی نظر بد سے بچائیں۔ لوگ فرط شوق اور شدت عشق کی وجہ سے اسے دیکھتے ہیں، جس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ خوف کے سبب سے اس کا رنگ زرد ہو گیا ہے اور اس لیے بھی کہ محافظوں کو اس کی طرف سے تشویش ہے۔ بس خدا اس باغ کی حفاظت فرمائے جس میں وہ صاحب جمال جلوہ فرما ہے۔ اس کی سانسیں معطر اور خوشبودار ہیں۔

غلام علی آزاد بلگرامی نے صندل اور فالسے کا ضمناً ذکر کیا ہے:

أسمائنا المیساء غصن الصندل — او ما تشم اریجها فی المحفل [۱]

لا غرو ان حیی العشاق قبل غد — من بعد ما احرقتهم نار اشواق [۲]

الا تری فی بلاد الهند فالسة — تنمو وتثمر حبا بعد احراق [۳]

ناز وانداز سے چلنے والی ہماری محبوبہ اسماء صندل کی ٹہنی ہے۔ اے مخاطب! کیا تجھکو محفل میں اس کی خوشبو محسوس نہیں ہوتی۔ جن عشاق کو عشق کی آگ نے جلاکر فنا کر دیا ہو، اگر وہ کل (یعنی قیامت) سے پہلے زندہ ہو جائیں تو یہ بات قابل حیرت نہ ہوگی۔ کیا تو نے ہندستان میں فالسہ نہیں دیکھا جو جلائے جلنے کے بعد نشو ونما پاتا ہے اور پھل لاتا ہے۔

ہندوستانی راجے مہاراجے قدیم زمانے سے عام سواری کے علاوہ میدان جنگ میں بھی ہاتھی کا استعمال کرتے تھے۔ یہ ہاتھی تربیت یافتہ ہوتے تھے، ان کو دشمن سے مقابلہ اور مدافعت کرنا سکھایا جاتا تھا، قزوینی نے ہندوستان کے ایسے ہاتھیوں کے اوصاف بیان کرکے لکھا ہے کہ ایسا ہاتھی پانچ ہزار شہ سواروں پر غلبہ پانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ جنگ میں ہاتھیوں کی فوج آگے رکھی جاتی تھی۔ میدان کارزار میں ان کی پیش قدمی فتح وکامرانی

---

[۱] سبحة المرجان: ص ۱۳۹ [۲] ایضاً ص ۱۷۷ [۳] عجائب المخلوقات: ۴۰۰

کی مراوت اور ان کی پسپائی ہزیمت و شکست کی نشانی ہوتی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان حکمراں بھی لڑائیوں میں ہاتھی سے کام لیتے تھے۔

ہارون ملتانی ہندوستان کا پہلا عربی شاعر جس کی ولادت سرزمین ملتان میں ہوئی، وہ بنی ازد کے موالی میں تھا، اور ملتان کے گرد و نواح کا حاکم تھا، ایک مرتبہ اس کو کسی ہندوستانی راجہ سے لڑنا پڑا، راجہ کی فوج میں سپاہیوں کے آگے ہاتھیوں کی صف تھی۔ ہارون بے جھجک بڑے نشان کے ہاتھی کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچکر بڑی تیزی سے کپڑے میں سے چھپی ہوئی بلی کو نکال کر ہاتھی کے مستک پر دے مارا اور ہاتھی کے وار سے پہلے ہی چھلانگ لگا کر اس کے سینے سے چمٹ گیا اور اس کے دونوں دانتوں کو گرفت میں لے لیا، ہاتھی اس ناگہانی آفت سے خوف زدہ بھی ہوگیا اور غضبناک بھی مگر ہارون بہادری سے اس کے مقابلہ میں ڈٹا رہا، اور آخر کار اس کے دانتوں کو جڑ سے اکھاڑ لیا، اب ہاتھی گھبرا کر اپنی فوج کو روندتا ہوا بھاگا۔ لشکر کی ترتیب بگڑ گئی، راجہ مارا گیا اور ہارون فتحیاب ہوا، اس فتح کی یادگار میں ہارون نے جو قادر الکلام شاعر تھا کئی قصیدے لکھے، جن میں جنگ کے حالات کے ساتھ ہاتھی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے۔ اب ان قصائد کے صرف چھتیس ۳۶ اشعار ملتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

[۱] ولما اتانی انھم یعقدونہ — بقائم سیف فاضل الطول العرض

مدرت ولم احفل بذالک منھم — اذا کان انف الفیل فی عفر الارض

وحین رأیت السیف یھتز قائما — دیلمع لمع البرق بالبلد المفضی

وصار کمخراق بکف حزور — یصرفہ فی الرفع طورا وفی الخفض

[۵] واقبل یفری کل شیٔ سما لہ — وصرت کانی فوق مزلقۃ دحض

[۶] واھوی نجاتی۔ فاغتنمت ذھولہ — ولم یقترب عنہ اخو ثقۃ محض

[۷] فجال، وجال القرن فی کف ماجد — کثیر مراس لحروب مجتنب الخفض

[۸] فطاح، وولّی ھاربا لا تھیدہ — رطانۃ ھندی برفع ولا خفض

[۱] جب ہاتھی میرے سامنے آیا جس کو اہل ہند لمبی چوڑی تلوار سونڈ میں دیکر جنگ کے لیے سدھاتے ہیں۔ تو [۲] میں نے پیش قدمی کی اور اہل ہند کی اس تدبیر کو خاطر میں نہ لایا کیونکہ ہاتھی کی سونڈ خاک آلود تھی اور یہی اس کی پسپائی کی علامت تھی۔ میں [۳] نے دیکھا کہ ہاتھی کھڑا ہوا تلوار کو حرکت دے رہا ہے اور وہ فضا میں بجلی کے مانند چمک رہی ہے۔ تلوار [۴] اس طرح حرکت میں تھی جیسے کسی تنومند جوان کے ہاتھ میں بچوں کے کھیل کا کوڑا۔ وہ کبھی اس کو بلندی میں حرکت دیتا تھا اور کبھی نیچے کی جانب۔ وہ [۵] ہر چیز کو روندتا ہوا آگے بڑھا اور میں گویا ایک رسوا کن پھسلن میں پھنس گیا، میں [۶] اپنی نجات چاہتا تھا لیکن اس وقت میں نے اس کو بھلا دیا، حالانکہ ایسے وقت میں کوئی دلیر انسان ہاتھی کے قریب نہیں آتا، اس [۷] وقت وہ میدان میں سرگرداں تھا، اور ایسے شریف آدمی کے ہاتھ میں شمشیر جولاں تھی جو بہت زیادہ طاقتور، جنگجو اور پستی سے گریز کرنے والا ہے۔ ہاتھی [۸] ادھ موا ہوکر بھاگ نکلا اور فیل بان کی ڈانٹ پھٹکار اسے میدان میں نہ روک سکی۔

[۱] مشیت الیہ رادعا متمھلا — وقد وصلوا خرطومہ بحسام

[۲] فقلت لنفسی: انہ الفیل ضاربا — بابیض من ماء الحدید ھذام

فان تنکنی منه افعد رکدا ضخم — لدی کل مشحوب الفؤاد عبام

وعند شجاع القوم اکلف فاحم — کظلمة لیل جللت بقتام

ولما رأیت السیف فی رأس هضبة — کما لاح برق من خلال غمام

فعافسته حتی لزقت بصدره — فلما هوی، لازمت ای لزام

وغدت بنابیه، وادبر هاربا — وذلک من عادات کل محامی

فحال، وهجیراه صوت مخضرم — وابت بقرنی یذبل وشمام

میں للکارتا ہوا پا پیادہ پورے سکون کے ساتھ ہاتھی کی طرف بڑھا، حالانکہ حریف نے ہاتھی کی سونڈ سے تلوار دے رکھی تھی۔ میں نے اپنے نفس سے دل میں کہا کہ وہ ایسی تیز شمشیر سے حملہ آور ہوگا، جو اپنی آب و تاب سے چمک رہی ہے اور تیز و براں ہے اگر تو ہاتھی کے مقابلے سے راہ فرار اختیار کرے، تو بھی ہر بزدل دکمزور کے نزدیک تیری معذرت قابل قبول ہے۔ قوم کے بہادر کے نزدیک وہ گہرا سیاہ فام تھا جیسے رات کی تاریکی جو سیاہی سے ڈھک گئی ہو۔ جب میں نے ایک چھوٹی پہاڑی (یعنی ہاتھی کے سر) کے سرے پر تلوار دیکھی، جو اس طرح چمک رہی تھی جیسے کالی گھٹا میں بجلی چمکتی ہے، تو میں اس سے کشتی لڑنے لگا، یہاں تک کہ اس کے سینے سے چمٹ گیا اور جب وہ گرا، تو میں نے خوب درگت بنائی۔ میں نے اس کے دانتوں کو اکھاڑ ڈالا اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا۔ ہر مدافعت کرنے والے کی یہی عادت ہوتی ہے۔ انجام کار ہاتھی ہیبت ناک اور کرخت آواز کے ساتھ چنگھاڑتا ہوا واپس ہوا، اور میں یذبل وشمام، دو پہاڑیوں کی چوٹیوں جیسے ہاتھی دانت لے کر لوٹا۔

فکنت فی طلبی من عنده فرجا — کراکب الفیل وحشیا ومقتلما [1]

[1] کتاب الحیوان: ص ۱۸۰

وقد کنت صعدت عن بغبو مفتریا — حتی لقیت بها حلف الذی حکما

قوم، کان ضیاء الشمس سنته — لونا لحق الشمس، القت نحوه الکلما

میں اس سے اپنی نجات اسی طرح چاہتا تھا جس طرح حبشی اور بدمست ہاتھی کا سوار چاہتا ہے۔ میں بغبور سے ہٹ کر دور ایک جگہ چلا گیا، جہاں ایک سخی حاکم سے میری ملاقات ہوگئی۔ یہ ایک بڑا سردار ہے۔ سورج کی روشنی گویا اس کا دائرہ ہے، اگر وہ آفتاب سے ہم کلام ہو تو آفتاب بھی اس سے گفتگو کرے گا۔

الیس عجیبا بان تلقه — له فطن الانس فی جرم فیل [1]

واطرف من فتنه نز دله — یحلم یجل عن الخنثلیل

الیس عجیبا بان بلعما — غلیظ الدراک، لطیف الخویل

واوقص، مختلف خلقه — طویل النیوب، قصیر النصیل

ویخضع للیث لیث العرین — بان ناسب لهرمن رأس میل

ویلقی العدو بناب عظیم — وجوف رحیب وصوت ضئیل

واشبه شئ اذا قسته — بخنزیر بر وجاموس غیل

ینازعه کل ذی اربع — فما فی الانام له من عدیل

ویعصف بالببر بعد النمور — کما تعصف الریح بالعندبیل

ویشخص یری یده انفسه — فان وصفوه، فسیف صقیل

واقبل کالطود هادی الخمیس — بصوت شدید امام الرعیل

ومر یمیل کسیل الاتی — بخطو خفیف، وجرم ثقیل

[1] کتاب الحیوان ۱، ص ۷۶، ۷۷؛ مروج الذهب ۱، ص ۲۳۹، ۲۴۰

فان [۱۳] شممته، زادنی هولہ — شناعة اذنین فی راس غول

وقد [۱۴] کنت اعددت مرالہ — قلیل التهیب للزند بیل

فلما [۱۵] احس به فی العجاج — اتانا الالہ بفتح جلیل

فطار [۱۶]، دراغم فیالہ — بقلب نجیب، وجسم ثقیل

فسبحان [۱۷] خالقه وحده — الہ الانام، ورب الفیول

کیا [۱] یہ تعجب کی بات نہیں کہ جثہ اور ڈیل ڈول میں ہاتھی ہوتے ہوئے بھی سوجھ بوجھ میں انسان جیسا ہے۔ ہاتھی [۲] کے کوہ پیکر ہونے سے زیادہ تعجب خیز اس کی سبک رفتاری ہے، جس میں متانت ہے اور بڑے بوڑھے جیسا بھاری بھرکم پن ہے۔ کیا [۳] یہ حیرت کی بات نہیں کہ ہاتھی کی غذا کھردری اور سخت ہوتی ہے، مگر وہ اس کے استعمال میں شریف ہے اور نظم سے کام کرنے والا ہے۔ وہ [۴] کوتہ گردن ہے، اس کی خلقت عام جانداروں سے جدا ہے، اس کے دانت لمبے اور آنکھیں چھوٹی ہیں، وہ [۵] جنگل کے شیر کے سامنے جھک جاتا ہے، اس لیے بلی کو بھی دور سے دیکھ کر شیر کی مشابہت کی وجہ سے ڈر جاتا ہے۔ لمبے [۶] لمبے دانتوں، عظیم شکم اور ڈراؤنی چنگھاڑ کے ساتھ ہاتھی دشمن کے مقابل ہوتا ہے۔ اگر [۷] ذہن میں اس کا نقشہ جانا جا ہو تو جنگلی سور اور گنجان جھاڑی کی بھینس سے قریب تر شکل کا ہوتا ہے۔ ویسے [۸] چوپایہ ہونے میں ہر چوپایہ اس کے مشابہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مخلوق میں اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ وہ [۹] چیتوں کے بعد شیر ببر پر ٹوٹ پڑتا ہے، جس طرح کہ تیز و تند ہوا چھوٹے پرندوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ ہر [۱۰] دیکھنے والا اس کی ناک کو اس کا ہاتھ قرار دیگا، مگر اس کی ناک کا حلیہ بیان کیا جائے تو وہ ایک چمکدار تلوار معلوم ہوتی ہے۔

وہ [۱۱] بڑے پہاڑ کی مانند لشکر کا سردار بنکر کڑک دار آواز کے ساتھ ہراول دستے کے سامنے آیا

وہ [۱۲] دبے پاؤں عظیم الشان جسم کے ساتھ سیل رواں کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگا۔

تم [۱۳] اگر قریب ہو، تو معلوم ہوگا کہ کسی جن کے سر میں دو کان لگے ہوئے ہیں، جو اس کی دہشت و ہیبت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ہم [۱۴] نے مقابلے کے لیے ایک بلی چھپا کر لایا تھا، جو اس بڑے ڈیل ڈول والے جانور سے ڈرنے والی نہ تھی۔ لہذا [۱۵] جنگ کے گرد و غبار میں جب ہاتھی کو اس کا احساس ہوا تو بھاگا اور معبود حقیقی نے ہمیں شاندار فتح و کامرانی سے نوازا۔ ہاتھی [۱۶] اپنے فیل بان کی سرزنش کے باوجود تیز دل اور گراں ڈیل ڈول لیے ہوئے تیزی سے بھاگ نکلا۔ تعریف [۱۷] و توصیف کا سزاوار اس کا پیدا کرنے والا ہی ہے، وہ مخلوق کا معبود اور ہاتھیوں کا پروردگار ہے۔

امیر خسرو پان کی تعریف میں کہتے ہیں

انا ربنا من اهل الهند تجربة — هذا الن مرد قوتی ذالک الن [۱]

(ہمیں اہل ہند کے ذریعے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ زمرد (پان) موتیوں (دانتوں) کو قوی بنا دیتا ہے)

امیر خسرو کا یہ شعر نشاندہی کرتا ہے کہ ہندوستان میں کہانت، نجوم، سحر اور جنتر منتر کا پرانے زمانے سے رواج تھا،

انی رأیت رقاة الهند من طمع — یصیرون کراس الاید کفهم [۲]

(میں نے ہندوستان کے جھاڑ پھونک کرنے والوں کو دیکھا کہ وہ لالچ کے اندر اپنے ہاتھوں کو سانپ کے پھن کی طرح حرکت دیتے اور گھماتے ہیں)

---

۱ اعجاز خسروی ۱: ص ۲۵۲ ۲ ایضاً ۴: ص ۱۷

ابن معصوم نے ہندی معشوقہ کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کے ہندوؤں کے لباس دھوتی (ساری) کو ذکر کیا ہے :

وغادة من بنات الهند قد خطرت … في زيها بين اسجاف واستار[1]

فقلت لها: لما سرت في اللاذ ماشئة … يا جنة السير، بل يا جنة الساري

ایک ہندوستانی نازک اندام لڑکی اپنا مخصوص لباس زیب تن کیے پردوں میں سے دکھائی دی، جب وہ سرخ ریشمی کپڑوں میں ملبوس ہو کر اٹکھیلیاں کرتی چلی تو میں نے کہا: رفتار ہی دلکش نہیں، بلکہ ساری بھی خوب ہے۔

عبدالمعطی باکثیر نے شمع کو پہیلی کی شکل میں لکھا ہے :۔

ومعشوقة، هيفاء لدن قوامها … من البيض تزري بالمثقفة السمر[2]

اذا اصبحت، امست تحد لسانها … تفتق درع الليل من طلعة البدر

فضوء سناها قد محى آية الدجى … فصار نهارا ابيضا ساطع الفجر

تمد لسانا ناطقا غير ناطق … ومن غير اجفان مدامعها تجرى

وجلبابها يحكى لجينا بياضه … واحشاؤها زرت على لهب الجمر

اذا جمعت، تسمع بتصحيفه ولا … ت حين مناص" جاء في محكم الذكر

فدونكها لغزا واضحا قد شرحته … وبينته، لكن بنوع من الستر

وہ دراز قد، چھریرے بدن، پتلی کمر اور چربی کی وجہ سے نرم پنڈلی والی، سرخی مائل نیزوں کو عیب دار بنا دیتی ہے، جب رات ہو جاتی ہے تو وہ اپنی زبان کو تیز کرتی ہے، اور چہرۂ ماہتاب سے رات کی زرہ کے ٹانکے ادھیڑ دیتی ہے، اس کی روشنی نے تاریکی کا

---

[1] سبحۃ المرجان: ۷۵ [2] النور السافر: ۳۶۶

نشان مٹا دیا اور رات روز روشن بن گئی ہے اور صبح نمودار ہو گئی ہے، وہ نطق و گویائی کے بغیر اپنی نفع بخش زبان دراز کرتی رہتی ہے، اور پپوٹے کے بغیر اس کے آنسو بہتے رہتے ہیں، اس کی چادر سفیدی میں چاندی کے مشابہ ہے، اور اس کے اندرونی اجزا انگارے کی لپٹ سے چمکیلے بن جاتے ہیں، جب اس کے پگھلے ہوئے اجزا جمع کیے جائیں تو اس کی تصحیف کا پتہ چلے گا، اگرچہ تیرا یہ فعل بے سود ہوگا۔ قرآن مجید میں "لات حین مناص" نازل ہوا ہے، یعنی بے فائدہ اور بعد از وقت پشیمانی بے فائدہ ہے، اس واضح چیستاں پر غور کر جس کی میں نے تشریح و توضیح تو کی ہے، مگر کسی قدر پردہ رکھتے ہوئے۔

سید حسن علی خاں بارہویں ماہ ربیع الاول کی بارہ راتوں کو چراغاں کیا کرتے تھے، سید عبدالجلیل بلگرامی چراغاں کا منظر بتاتے ہوئے قصیدہ بردہ کے ایک مصرع کو بطور تضمین درج کیا ہے۔

اضاء ركن الاعالي سيد الامراء … شهر الرسول شموعا في غياهبه[1]

امسى الشموع على الحضار منشدة … ان الرسول لنور يستضاء به

رکن الاعالی، سید الامراء (سید حسن علی خاں) نے تاریکیوں میں بہت سی شمعیں جلا کر ماہ رسول (ربیع الاول) کو روشن بنا دیا ہے۔ شمعوں نے (زبان حال) حاضرین کو پڑھ کر سنانا شروع کر دیا کہ 'رسول بے شک ایسے نور مجسم ہیں جس سے روشنی حاصل کیجاتی ہے۔'

(باقی)

---

[1] سبحۃ المرجان: ۱۰

مشگن یونیورسٹی (امریکہ)

میں

عربی، فارسی اور ترکی زبان کے قلمی نوادر

از جناب احتشام بن حسن صاحب، ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کے ستائیسویں اجلاس منعقدہ مشگن یونیورسٹی کی روداد فاضل جلیل ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے قلم سے نومبر ۱۹۶۷ء کے معارف میں شائع ہو چکی ہے۔ اب مشگن یونیورسٹی کے عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات کا تعارف ایک دوسرے شریک اجلاس کے قلم سے شائع کیا جاتا ہے۔

م

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کے ستائیسویں اجلاس میں شرکت کی غرض سے مجھے ۱۳ اگست ۱۹۶۷ء کو امریکہ کی مشہور جامعہ مشگن یونیورسٹی (این آربور) جانے کا اتفاق ہوا، یہ یونیورسٹی امریکہ کی قدیم یونیورسٹیوں میں شمار کی جاتی ہے، اس کی تاسیس ۱۸۲۹ء میں ہوئی، یہ اپنی شاندار قدیم علمی روایات اور اعلیٰ معیار تعلیم کی بنا پر پورے امریکہ میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے، سائنس، ٹکنالوجی اور سوشل سائنسز کے علاوہ دنیا کی بیشتر زبانوں بالخصوص فرانسیسی، جرمن، لیٹن، گریک، اسپینش، اٹیلین، پرتگالی، کورین، جاپانی، چینی، روسی، عبرانی، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی تدریس اور لسانیات پر تحقیقات کا انتظام ہے، شرق اوسط کے ممالک میں مروج زبانوں کا ایک الگ شعبہ قائم ہے جس کے صدر پروفیسر کیمرون ہیں، جنوبی

افریقہ اور مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کے متعلق سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریکات پر تحقیقی کام کرنے کی غرض سے ایک الگ شعبہ قائم ہے، جس میں اس خطہ کی قدیم تہذیب، معاشرت، تاریخ و فلسفہ کے علاوہ موجودہ سیاسی و سماجی مسائل پر تحقیقی کام ہو رہا ہے، اس شعبے کے صدر پروفیسر شورگر (Prof. Schorger) ہیں، ان کے علاوہ پروفیسر جورانی بھی اسی شعبے میں تاریخ اسلام کے معروف استاد ہیں، اس یونیورسٹی کی لائبریری میں اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر رسائل و کتب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، ان کتب و مجلات کی مجموعی تعداد دس ہزار سے کم نہیں، ان میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں گرانقدر کتابیں موجود ہیں، بائبل کے قدیم ترین نسخے، دینیات، قوانین، ریاضی و ہیئت اور علم فلکیات سے متعلق اہم قلمی نسخے بھی اس لائبریری کی زینت ہیں، عربی، فارسی اور ترکی زبان میں لکھے ہوئے مندرجہ ذیل قلمی نسخے میری نظر سے گذرے، جن کے بارے میں عام معلومات کہیں دستیاب نہیں ہوتیں، کسی بھی مغربی یا مشرقی فہرست نگار نے ان قلمی نوادر کا ذکر نہیں کیا، تعجب ہے کہ بروکلمان، پروفیسر براؤن، اسٹوری اور الزرکلی وغیرہ کسی کو بھی مشگن یونیورسٹی لائبریری میں مخزونہ ان نادر مخطوطات کا علم نہ ہو سکا، ذیل میں ان مخطوطات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے،

عربی

(۱) **الطراز المنقوش فی محاسن الحبوش**۔ مصنفہ محمد بن عبد الباقی علاء الدین البخاری المکی، ابو المعالی کنیت۔ متوفی ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء۔ یہ تصنیف ابی سینا (حبشہ) پر بہت دلچسپ اور اہم کتاب ہے، سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے،

خیر الدین الزرکلی نے الاعلام (ج ۷، ص ۵۴) میں اس کا نام الطراز المنقوش فی فضائل الحبوش لکھا ہے، بروکلمان نے اس مخطوط کے دوسرے نسخے، برٹش میوزیم لندن (۶۰۲)، رام پور (۱/۶۱۰)، پیرس (۴۶۳، ۲۱)، کتب خانہ خدیویہ مصریہ قاہرہ (۵۵–

میں بتائے ہیں (دیکھئے بروکلمان: ضمیمہ دوم ص ۵۱۹)

(۲) التیسیر والتسہیل فی ذکر ما اغفلہ الشیخ الخلیل - مصنفہ ابو زید عبدالرحمن ابن عبدالقادر بن علی، المعروف بہ الفاسی، متوفی ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء، یہ مقام فاس کے باشندے تھے، اور اپنے زمانہ میں ممتاز مقنن و فقیہ مانے جاتے تھے، پیش نظر مخطوطہ فقہ مالکی پر خلیل ابن اسحٰق (متوفی ۷۶۷ھ/۱۳۶۵ء) کی کتاب "المختصر" کا ضمیمہ ہے، جس میں بالتخصیص زرعی پیداوار کے مسائل پر فقہ مالکی کے قوانین کی تشریح کی گئی ہے، کاتب کا نام مرقوم نہیں، البتہ سنہ کتابت شعبان ۱۱۳۴ھ مطابق اپریل ۱۷۲۲ء درج ہے۔

(۳) منظومۃ فی الخلافیات - عمر بن محمد النسفی، متوفی ۵۳۷ھ مطابق ۱۱۴۲ء، مشہور مفسر قرآن اور عالم و فقیہ ہیں، نسف میں پیدا ہوئے اور سمرقند میں وفات پائی، تقریباً سو کتابوں کے مصنف بتائے جاتے ہیں،

پیش نظر مخطوطہ میں ائمہ اربعہ کے فقہی اختلافات پر بحث کی گئی ہے، اور چاروں مکتبۂ فکر کے اصول و ضوابط کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے ان کے اختلاف رائے پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ قدیم مخطوطہ خیال کیا جاتا ہے، اس کی کتابت طاہر ابن عثمان نے یکم ذوالقعدہ ۷۳۵ھ مطابق ۲۳ رجب ۱۳۳۵ء میں کی تھی،

خیرالدین الزرکلی نے "اعلام" میں اس کتاب کا نام "منظومۃ الخلافیات" لکھا ہے، (دیکھئے اعلام ج ۵ ص ۲۲۲)، لیکن بروکلمان نے "المنظومۃ النسفیۃ فی الخلافیات" لکھا ہے، (بروکلمان: ج ۱ ص ۵۴۸) بروکلمان کو جن نسخوں کی اطلاع مل سکی وہ حسب ذیل ہیں:

برٹش میوزیم (جلد ۱ ۷۱ - ۲۲۰ DL ۵۸۸۴) ای، جے برل لیڈن (فہرست نمبر ۱۸۲۵/۹) (۴۲۶) کتب خانہ خدیویہ مصریہ (زیر نمبر ۱۰۵۹) کتب خانہ خدابخش، بانکی پور (ج ۱۹ x نمبر ۱۶۰۹) (حوالے کیلئے دیکھئے: بروکلمان۔ ضمیمہ ج ۱ ص ۷۵۸)

(۴) تذکرۃ النسیان فی اخبار ملوک السودان - مرتبہ قاضی محمود کوتی ابن متوکل کوتی الکرمانی، التمبکتی ابو عکری (سال وفات نامعلوم، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں ٹمبکٹو میں انتقال کیا)، یہ تذکرہ ان سلاطین کے حالات پر مشتمل ہے جنھوں نے ۱۵۹۰ء تا ۱۷۵۰ء تک سوڈان پر حکومت کی تھی، یہ سلاطین ٹمبکٹو میں رہتے تھے، نسخے پر کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں،

(۵) المقصد الاسنیٰ - مصنفہ ابو حامد محمد بن محمد الغزالی متوفی ۵۰۵ھ مطابق ۱۱۱۱ء - یہ رسالہ فلسفہ الٰہیات اور وجود باری تعالیٰ کے مباحث پر مشتمل ہے، پیش نظر نسخے کی کتابت رازی نے تبریز میں ۷۴۶ھ مطابق ۱۳۴۵ء میں کی تھی،

خیرالدین الزرکلی نے "الاعلام" میں اس رسالہ کا پورا نام "المقصد الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ" لکھا ہے۔ (دیکھئے الاعلام، ج ۷، ص ۲۴۷)

بروکلمان کو اس رسالہ کے جن نسخوں کی اطلاع مل سکی، وہ حسب ذیل ہیں:-

برٹش میوزیم لندن (زیر نمبر ۲ D/۹ - ۷۳۵۷)؛ کتب خانہ خدیویہ مصر قاہرہ (ج ۱/ ۲۲۲ روم میں (Vat. V. Borg) ۱۲۶ع پر محفوظ ہیں۔

(۶) لذۃ السمع فی وصف الدمع - مرتبہ خلیل بن ایبک بن عبداللہ الصفدی (متوفی ۱۰ شوال ۷۶۴ھ مطابق ۲۴ جولائی ۱۳۶۳ء) یہ اپنے عہد کے ممتاز ادیب اور مورخ ہیں، مختلف تذکرے اور رسائل ان کی یادگار ہیں، پیش نظر مخطوطہ عربی زبان میں مختلف شعراء کے حزنیہ کلام کا انتخاب ہے، جس میں ۳ طویل نظمیں شامل ہیں، آخر میں مرتب کے اشعار درج ہیں، مخطوطہ پر سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے،

خیرالدین الزرکلی نے "الاعلام" میں اسی مرتب کے ایک اور مجموعہ کا نام زیر بحث مجموعہ کے

نام سے ملتا جلتا لکھا ہے "تشنیف السمع فی انسکاب الدمع"۔ ممکن ہے دونوں مجموعے ایک ہی ہوں، اور الزرکلی کو جس مخطوطہ کی اطلاع ملی ہو اس پر یہی نام تحریر ہو۔ (دیکھئے "الاعلام" ج ۶ ص ۳۶۳)

(۷) **حاشیۃ علی رسالۃ ابی زید القیروانی** ۔ مصنفہ محمد بن محمد الحطاب المالکی (متوفی ۱۵۴۷ء)۔ یہ مالکی فقہ کے مستند عالم ہیں، مکہ میں پیدا ہوئے اور طرابلس میں وفات پائی، فقہ مالکی پر ان کی کئی اہم تصانیف ہیں، پیش نظر مخطوطہ فقہ امام مالک پر ابن زید کے "رسالہ" کی تشریح و توضیح ہے۔ اس نسخے کی کتابت مصنف کے لڑکے یحییٰ نے صفر ۱۰۴۰ھ مطابق ستمبر ۱۶۳۰ء میں کی تھی۔

خیر الدین الزرکلی نے "الاعلام" میں اس رسالہ کا نام "شرح نظم النظائر رسالہ قیروانی" لکھا ہے۔ (دیکھئے "الاعلام" ج ۷، ص ۲۸۶)

(۸) **مناقب امام الشافعی** ۔ مصنفہ ابن قاضی شہبہ، ابوبکر ابن احمد (متوفی ۱۴۴۷ء)۔ اس رسالہ میں امام شافعی کے حالات زندگی درج ہیں، یہ قدیم نسخہ خیال کیا جاتا ہے، اس پر عیسیٰ بن عیسیٰ الصفانی کے قلم سے اشارئیے درج ہیں، سنہ کتابت ۴ شعبان ۸۳۶ھ مطابق ۵ اپریل ۱۴۳۳ء رقم ہے لیکن کاتب کا نام درج نہیں ہے۔

(۹) **الشفا فی تعریف حقوق المصطفٰی صلعم** ۔ مؤلفہ عیاض بن موسیٰ معروف بہ قاضی عیاض (متوفی ۱۱۴۹ء)۔ یہ اپنے زمانے کے مشہور قاضی گذرے ہیں، سبتہ میں پیدا ہوئے، قرطبہ میں قاضی مقرر ہوئے اور مراکش کے شہر مکنس میں وفات پائی، ان کے حالات زندگی علامہ احمد المقری نے اپنی کتاب "ازہار الریاض" میں درج کر دیے ہیں تفصیل کے لیے دیکھئے "الاعلام" ج ۵ ص ۲۸۲)

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور نعت شریفہ پر مشہور کتاب ہے۔ سنہ کتابت ۱۸۵۳ء درج ہے۔

(۱۰) **الاشباہ والنظائر** ۔ مصنفہ زین الدین بن ابراہیم معروف بہ ابن نجیم (متوفی ۸ رجب ۹۷۰ھ مطابق ۴ مارچ ۱۵۶۳ء) یہ تصنیف کلیات فقہ و شریعت پر مشتمل ہے، اس نسخے کی کتابت عبد ابن ابراہیم الزابلی نے ۲۲ رجب ۱۰۸۶ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۶۷۵ء میں کی ہے، بروکلمان کو اس کے جن نسخوں کی اطلاع مل سکی وہ حسب ذیل ہیں (دیکھئے GAL جلد ۲ ضمیمہ ۴۲۵)

برٹش میوزیم لندن (زیر نمبر ۲ DL ۵۳۹۵) ٹرینٹی کالج کیمبرج کی لائبریری میں (نمبر ۱۴۴۱) کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد جلد نمبر ۲، نمبر ۱۰۷؛ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (نمبر ۱۰۶)؛ رضا لائبریری رام پور (نمبر ۱۲۵)؛ خدابخش لائبریری پٹنہ (جلد ۱۹ × ۲ د ۱۷۵۴-۵) میں محفوظ ہیں۔

یہ کتاب الحموی کی شرح اور مولوی گلزار و مولوی عبد الغنی کی تصحیح کے ساتھ ۱۲۶۰ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

(۱۱) **دلائل الخیرات وشوارق الانوار** ۔ مرتبہ ابو عبد اللہ محمد السملالی الجزولی (متوفی ۱۴۶۵ء)۔ اوراد و وظائف کا مشہور رسالہ ہے، اس نسخے کی کتابت محمد راسم نے کی تھی، سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ ابتدائی اوراق میں مدینہ اور مکہ کی قلمی تصاویر ہیں۔

(۱۲) **الحماسۃ لابی تمام** ۔ حبیب ابن اوس بن الحارث الطائی معروف ابو تمام (متوفی ۸۴۶ء)

یہ عظیم شاعر جاسم میں (۸۰۴ھ) میں پیدا ہوا، مصر اور بغداد میں مقیم رہا اور موصل میں مدفون ہوا، فصیح الکلام شاعر تھا، اس کو چودہ ۱۴ ہزار ارجوزے علاوہ عربی قصائد کے ازبر تھے۔ اس کا مرتبہ عربی شاعری میں متنبی اور بحتری کے برابر ہے (دیکھئے "الاعلام" جلد ۲ ص ۱۷۰)

اس حماسہ کی اشاعت پہلی بار بون میں ۱۸۲۸ء میں فریتاغ (Freytag) نے کی، پھر لاتینی زبان میں ترجمہ کے ساتھ ۱۸۵۱ء میں اور جرمن زبان میں ترجمے کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں شائع کیا گیا۔ پھر حواشی و تحقیق کے ساتھ عبد السلام ہارون اور احمد امین نے اس کو تین جلدوں میں ۱۹۵۲ء میں مصر سے شائع کیا، تفصیل دیکھئے دائرۃ المعارف، للبستانی جلد ۴ ص ۲۳)

پیش نظر مخطوطہ قدیم خیال کیا جاتا ہے، عربی شاعری کا یہ مجموعہ (Anthology) بڑی اہمیت کا حامل ہے، یہ خط نسخ میں مرقوم ہے، حاشیہ پر فارسی زبان میں اشارے بھی لکھے ہیں، راقم کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں۔

(۱۳) **القرآن** - قرآن پاک کا یہ قلمی نسخہ صدر اعظم نصوح پاشا کے ایک خاص مصاحب مصطفی ابن عبد اللہ معروف بہ الحاطمی نے جمادی الثانی ۱۰۳۲ھ مطابق اپریل ۱۶۲۳ء میں رقم کیا۔

(۱۴) **القرآن** - یہ قلمی نسخہ نہایت خوشنما ہے، اس کی صحت کتابت کی تصدیق میں دس قاریوں اور بیس حفاظ کے دستخط ثبت ہیں، جا بجا حاشیہ پر نوٹس بھی ہیں اور تشریحی و توضیحی حوالے محمد خلوصی کے قلم سے درج ہیں، اس کی کتابت حافظ عثمان نوری البرووری معروف بہ قیش زادہ نے ذوالحجہ ۱۳۰۹ھ مطابق جولائی ۱۸۹۲ء میں کی ہے۔ اس پر ملمع کاری کا کام الحاج احمد نے ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء میں کیا ہے۔

(۱۵) **القرآن** - یہ قلمی نسخہ سنہری زمین کے کاغذ پر تحریر کیا گیا ہے، اس کا سرورق بہت مزین ہے، اس کی کتابت کمال الدین محمد بن عبد الحق السبزواری نے رجب ۹۲۴ھ مطابق ۱۵۰۸ء میں کی ہے۔

(۱۶) **القرآن** - یہ قلمی نسخہ سنہری زمین کے کاغذ پر تحریر ہے، اس کے حاشیے پر فارسی زبان میں کسی نے تفسیر بھی لکھی ہے، مفسر کا نام اور اصل کاتب مخطوطہ کا پتہ نہیں چلتا، مشگن یونیورسٹی لائبریری میں یہ نسخہ Stephen Spaulding Collection سے حاصل کیا گیا ہے، اس کا نمبر ۳۸۴۹ ہے۔

(۱۷) **القرآن** - یہ قلمی نسخہ محمد عنبر آغا (استانبول) کو پیش کرنے کی غرض سے عثمان شاکر نے ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں تیار کیا تھا، اس پر ملمع کاری کا کام فیض اللہ نے کیا ہے۔ یہ ترکی جلد سازی کا بھی اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس کی تزئین و تہذیب قابل تعریف ہے۔

(۱۸) **القرآن** - پیش نظر مخطوطہ قرآن پاک کا ایک نامکمل حصہ ہے جو صرف ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ بقیہ لاپتہ ہے، ۵۰۷ھ سے قبل کی تحریر معلوم ہوتی ہے، ہر آیت کے اختتام پر سرخ روشنائی سے دائرہ بنایا گیا ہے، پہلا صفحہ "سورۃ النساء" سے شروع ہوتا ہے، خط کوفی ہے، کاتب کا نام بھی درج نہیں ہے۔

فارسی

(۱) **نفحات الانس من حضرۃ القدس**، بہ مرتبہ مولانا جامی (متوفی ۱۴۹۲ء) صلحاء و اخیار کا مشہور تذکرہ ہے، اس میں ۵۶۷ علماء، ادباء، صوفیہ اور شعراء کے سوانح حیات درج ہیں، ابو الہاشم الصوفی سے لیکر قاسم انوار (متوفی ۱۴۳۳ء) تک کے تمام ممتاز ادیب و شعراء اور صوفیہ کا ذکر ہے۔ یہ نسخہ محمد بن کمال نے ۹ ربیع الثانی ۹۲۰ھ مطابق ۳۰ جنوری ۱۵۱۴ء میں تحریر کیا ہے۔

استوری کو اس مخطوطہ کے جن نسخوں کی اطلاع مل سکی ہے وہ یہ ہیں: کتب خانہ عاشر
آفندی (قسطنطنیہ، حوالہ نمبر ۷۱۱)؛ پیرس میں (نمبر ۲۳۵/iii)، لیڈن میں (نمبر ۹۳۳)
برٹش میوزیم لندن میں (B ۳۴۹)۔ (دیکھئے پرشین لٹریچر از استوری جلد ۱ ص ۹۵۴)

(۲) دیوان صائب:۔ مرزا محمد علی صائب (متوفی ۱۶۶۹ء)۔ یہ صائب کی
غزلیات کا مجموعہ ہے، خط نستعلیق میں مرقوم ہے، مقصود علی شیرازی نے ذی الحجہ ۱۱۰۴ھ
مطابق اگست ۱۶۹۳ء میں لکھا۔

(۳) دیوان خاقانی شیروانی۔ خاقانی کے عہد کا قلمی نسخہ ہے۔ اس کو سلطان
محمد نے اپنے قلم سے ربیع الاول ۱۰۴۴ھ مطابق ستمبر ۱۶۳۴ء میں رقم کیا، پورا
دیوان مطلی ہے، حاشیہ پر بیل بنی ہوئی ہے۔ خط نسخ جلی اور صاف ہے۔
براؤن یا استوری کسی کو اس نسخہ کی اطلاع نہ مل سکی۔

(۴) دیوان محمد عاشق اصفہانی: عاشق اصفہانی (متوفی ۱۷۶۶ء) کا یہ دیوان
خط شکست میں مرقوم ہے، ہر صفحہ پر تصویر کشی کی گئی ہے، پورا نسخہ مصور ہے، حاشیہ پر بیل مذہب
ہے، کاتب کا نام درج نہیں ہے، سنہ کتابت ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۶ء عیسوی ہے۔

(۵) سلسلۃ الذہب:۔ مصنفہ مولانا جامیؒ۔ اس مخطوطہ کے ہر صفحہ پر جانوروں
کی تصویریں سنہرے نقش و نگار کے ساتھ بنی ہیں، لیکن ناقص الآخر ہے، اس لیے کاتب
کا نام اور سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔

(۶) دیوان ابو طالب کلیم:۔ ابو طالب کلیم (متوفی ۱۶۵۱ء) ابو طالب کلیم
کی غزلیات پر مشتمل یہ دیوان فارسی شاعری کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے، پیش نظر مخطوطہ شاہجہاں
کے دور حکومت میں ہندوستان میں تھا، یہاں سے ہمدان پہنچا، وہاں سے شنگٹن یونیورسٹی

لایا گیا، خط نسخ میں تحریر ہے، کاتب کا نام اور سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔

(۷) خمسۂ نظامی گنجوی۔ نظامی گنجوی (متوفی ۱۲۰۳ء) کی پانچ طویل غزلوں
کا مجموعہ ہے جس کی پہلی غزل کا عنوان "خسرو شیریں" ہے، کاتب کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔
تاریخ کتابت یکم ربیع الاول ۱۲۴۰ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۸۲۴ء درج ہے۔

(۸) یوسف و زلیخا۔ مولانا جامی (متوفی ۱۴۹۲ء) کا یہ مایہ ناز شاہکار گیارہ
خوبصورت تصاویر سے مزین ہے، تصویریں چینی آرٹ اور فن تصویر کشی کی نقل معلوم
ہوتی ہیں، اس میں اس واقعہ کو مصور کیا گیا ہے، کہ ایک مصری خاتون حضرت یوسف علیہ السلام
پر عاشق ہو جاتی ہے، اس کا جذبۂ عشق اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ عالم بیخودی میں اپنے ہاتھ
کاٹ ڈالتی ہے، اس مخطوطہ پر راقم کا نام درج نہیں ہے، تاریخ کتابت ۲۴ ذی الحجہ
۱۰۰۶ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۵۹۸ء درج ہے۔

(۹) عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات۔ مصنفہ زکریا ابن محمد القزوینی۔
(متوفی ۶۸۲ھ - ۱۲۸۳ء) یہ رسالہ فارسی زبان میں قزوینی کی اصل عربی کتاب کا ترجمہ
ہے، جس میں سرگذشت عالم اور سفلی دنیا کے معاملات کو تصویروں کے پیکر میں ظاہر
کیا گیا ہے، ابتدائی اوراق میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسحق علیہما السلام کی تصویریں
بنائی گئی ہیں، کاتب کے نام اور تاریخ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔ خیر الدین الزرکلی کی اطلاع
کے مطابق قزوینی کی مذکورہ کتاب کے ترجمے، فارسی، جرمن اور ترکی زبانوں میں ہو چکے
ہیں، (الاعلام ج ۳ ص ۸۰)

(۱۰) مجلس العشاق۔ مصنفہ کمال الدین حسین قرگاہی۔ مصنف نے یہ کتاب
اپنے ممدوح خاندان تیموری کے آخری تاجدار سلطان حسین کو پیش کی، اس میں صوفیہ اور

اولیائے کرام کے حالات درج ہیں، ۸۰ تصاویر سے آراستہ ہے، کاتب کا نام محمد ابن یا
محمد النجاری ہے۔ سنہ کتابت ۱۰۰۶ھ مطابق ۱۵۹۷ء ہے۔ اسٹوری کو اس مخطوطے
کے جن نسخوں کا علم ہو سکا وہ یہ ہیں، کتب خانہ ایا صوفیہ (ترکی) نمبر ۴۲۲۸۰) بوڈلین
ہیں (نمبر ۱۲۷۱) خدا بخش لائبریری بانکی پور (viii) نمبر ۶۶۳) اور کتب خانہ آصفیہ
حیدرآباد نمبر ۱۰۶۶) میں محفوظ ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے اسٹوری جلد ۷ ص ۹۶۱
براؤن: لٹریری ہسٹری آف پرشیا ج ۳ ص ۴۵۷)

(۱۱) روضۃ الانوار۔ خواجہ کرمانی (متوفی ۱۲۸۱ء) کے مشہور خمسہ کا یہ چوتھا
حصہ ہے، جس میں نظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب اتارا گیا ہے، اس کی کتابت نہایت اعلیٰ
اور خط نہایت دیدہ زیب ہے، کاتب کے نام اور سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔

(۱۲) مثنوی مولانا روم۔ اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ خود مصنف مولانا روم کے
قلم کا لکھا ہوا ہے، اس پر حوالہ کے طور پر لکھا ہوا ہے کہ مشگن یونیورسٹی میں یہ نسخہ
Stephen Spauding Collection سے آیا ہے۔ سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

(۱۳) زاد المعاد۔ فارسی زبان میں شیعہ فرقہ کے آخری امام کے اوراد و وظائف
کا مجموعہ ہے، جو "بحار الانوار" سے ماخوذ ہیں۔ اس مخطوطہ کو ملا محمد باقر المجلسی
(۱۱۰۰ھ) نے رقم کیا ہے، سنہرے حاشیے اور خوبصورت سر ورق سے مزین ہے۔

ترکی

(۱) حدیقۃ السعادہ۔ مترجمہ محمد فضولی (متوفی ۱۵۵۵ء)۔ شہدائے کربلا
پر ملا حسین واعظ کاشفی کی "روضۃ الشہداء" کا ترکی زبان میں ترجمہ ہے، اس کے مترجم
محمد فضولی ہیں جو عربی، فارسی اور ترکی زبان کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے،
انھوں نے بغداد میں ایرانی عہد اور ترکی عہد دونوں دیکھے تھے، سنہ کتابت

ذی القعدہ ۱۱۰۶ھ مطابق جون ۱۵۹۸ء ہے۔ یہ مخطوطہ بہت پاکیزہ اور خط نسخ
کا اعلیٰ نمونہ ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے، پرشین لٹریچر از اسٹوری، ص ۲۱۳)

(۲) معرفت نامہ۔ مرتبہ ابراہیم حقی (متوفی ۱۷۷۲ء) یہ ترکی زبان
میں تاریخ و جغرافیہ کی انسائیکلوپیڈیا ہے، جو ۱۷۵۶ء میں مرتب کی گئی، اس میں دنیا
کے جغرافیہ کا ایک نقشہ بھی دیا گیا ہے، جسے حسین الغنی نے تیار کیا تھا، اس مخطوطہ کی کتابت
عبداللہ بن فیض اللہ شاگرد رشید محمد تیمور اکمالی نے ۱۸۲۱ء میں کی ہے۔

یہ مخطوطات اپنے موضوع و مباحث کے اعتبار سے بھی اہمیت رکھتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ
مشگن یونیورسٹی لائبریری نے ابتک ان مخطوطات کا تفصیلی کیٹلاگ (فہرست) شائع نہیں کیا۔
میں نے اپنے دوران قیام میں یونیورسٹی کے لائبریرین پروفیسر مہرات جبین سے ان مخطوطات کا تفصیلی
کیٹلاگ شائع کرنے کی درخواست کی ہے، موصوف نے اس درخواست کو قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے،
ان کو مشرقی علوم و فنون سے بے حد دلچسپی ہے، انکی خواہش ہے کہ وہ علوم اسلامیہ سے متعلق ایک گرانقدر
ذخیرہ اپنی لائبریری میں محفوظ کر دیں۔

دنیا کی مختلف لائبریریوں میں پھیلے ہوئے مخطوطات کے علم کے لیے ایک عالمی
ادارہ کی عرصہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، جس کے ذریعہ اہل علم کو
ان مخطوطات کا علم ہو سکے، اور ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا جا سکے۔
اس سلسلے میں مستشرقین کی ایک عالمی کانگریس کے چھبیسویں اجلاس
منعقدہ دہلی میں ترکی کے مشہور پروفیسر ذکی ولیدی طوغان نے دنیا کے
مختلف گوشوں سے آئے ہوئے نمائندوں کے ایک مخصوص اجلاس میں
اس کی تجویز پیش کی تھی، لیکن افسوس کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اگر

یہ تجویز عملی شکل اختیار کرے تو منتشر علمی دفینوں کی بازیافت ہو سکے، اور تحقیق کے کاموں میں سہولت پیدا ہو جائے۔

امریکہ میں مجھے "کولمبیا" یونیورسٹی (نیویارک) دیکھنے کا موقعہ ملا، وہاں بھی اسلامی علوم اور عربیات سے متعلق بیش بہا ذخیرۂ کتب موجود ہے، اسکے علاوہ مغربی جرمنی میں "فرینک فرٹ" یونیورسٹی اور گوئٹے یونیورسٹی دیکھنے کا اتفاق ہوا، ان جامعات میں اسلامی علوم کی تحقیق وتدریس کے متعلق انشاء اللہ جلد ہی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

صغانی لاہوری کا سنہ ولادت

از

جناب احمد خانصاحب ایم اے اسلام آباد پاکستان

معارف ۱۹۵۹ء میں جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی نے صغانی لاہوری پر ایک نہایت ہی جامع مضمون تحریر فرمایا ہے، فاضل مقالہ نگار نے بڑی محنت و دیدہ ریزی سے صغانی کی کتابوں سے مواد فراہم کیا ہے، اس مضمون میں چشتی صاحب نے امام صغانی کی زندگی کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور چند مقامات پر جمہور مورخین سے اختلاف بھی کیا ہے، اور اپنی تائید میں زیادہ تر صغانی کی کتابوں سے شواہد پیش کیے ہیں، اس لیے ان کی رائے نہایت ہی قیمتی سمجھی جاسکتی ہے، البتہ فاضل مقالہ نگار نے امام صغانی کی تاریخ ولادت کے سلسلہ میں جو بحث کی ہے وہ محل نظر ہے۔

عام طور پر صغانی کی ولادت کا سنہ ۵۷۷ھ بتایا گیا ہے، مشہور مورخ شمس الدین الذہبی، ابن شاکر کتبی، ابو رافع السلامی، طاش کبری زادہ سیوطی، کفوی، آزاد بلگرامی، نواب صدیق حسن خاں، عبد الحی فرنگی محلی، خوانساری اور ڈاکٹر ہفنر، ان سب کا اس تاریخ پر اتفاق ہے، مگر چشتی صاحب کے خیال میں امام صغانی کی ولادت کا سنہ ۵۵۵ھ ہونا چاہیے، پھر دلائل سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے[1]۔

---

[1] دیکھئے معارف جنوری ۱۹۵۹ء صفحہ ۱۰ تا ۱۶

تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود صغانی لاہوری کی کسی تحریر میں سنہ ولادت کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، ان کے سب سے قریبی عہد کے تذکرہ نگار شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ) نے جو تاریخ بتائی ہے اس پر سارے تذکرہ نگاروں نے انحصار کیا ہے، اور اپنی تحقیق کے مطابق ۵۷۷ھ لکھا ہے، صدیوں بعد تاج العروس کی عبارت سے امام صغانی کی تاریخ ولادت ۵۵۵ھ ظاہر ہوتی ہے۔[1]

لغت کی اس کتاب میں سنین تاریخ عموماً ہندسوں میں درج ہیں، اور ہندسوں میں غلطی کا احتمال رہتا ہے، اس لیے انکی تاریخوں پر اعتبار ذرا مشکل نظر آتا ہے، خود جشتی صاحب کو بھی اس تحریر پر اطمینان نہیں ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: "احتمال ہے کہ اصل وہ ۵۷۷ھ ہو جو ادنیٰ تغیر سے ۵۵۵ھ بن گیا ہو، تاج العروس میں اکثر ایسا ہوتا ہے"، اس احتمال کے اظہار کے بعد اس تاریخ ولادت کا اثبات اس طرح کرتے ہیں:-

"یہاں کچھ قرائن ایسے موجود ہیں جن سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ جو سال ولادت سید مرتضیٰ زبیدی نے نقل کیا ہے، وہی صحیح ہے"

پھر جشتی صاحب نے اولین قرینہ یہ بیان کیا ہے کہ

"سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں شمس الدین الذہبی کے حوالہ سے صغانی کا سال ولادت ۵۵۵ھ نقل کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سید مرتضیٰ زبیدی کے پیش نظر تاریخ اسلام کا جو نسخہ تھا، اس میں یہی سال ولادت مذکور تھا"

ممکن ہے اختلاف نسخ کی وجہ سے یہ اختلاف رونما ہو گیا ہو، مگر علامہ ذہبی پورے وثوق کے ساتھ امام صغانی کا سنہ ولادت ۵۷۷ھ اور ان کی عمر تہتر سال بتاتے ہیں، جیسا کہ دول الاسلام میں رقمطراز ہیں:-

[1] تاج العروس مادہ: صغن

(سنۃ خمسین وستمائۃ) مات العلامۃ رضی الدین الحسن بن محمد الھندی الصغانی صاحب التصانیف ببغداد ولہ ثلاث وسبعون سنۃ[1]

(۶۵۰ھ) علامہ رضی الدین الحسن بن محمد الہندی الصغانی جو صاحب تصنیف ہیں، ان کا بغداد میں انتقال ہوا اور ان کی عمر تہتر سال ہے۔

اس تصریح سے سنہ وفات میں سے تہتر کی تفریق کے بعد سن ولادت ۵۷۷ھ ہی بنتا ہے، خود مرتضیٰ زبیدی صاحب تاج العروس، شرح خطبۃ المصنف میں بالکل صحیح سنہ ولادت تحریر فرماتے ہیں؛ لکھا ہے کہ

"(العباب) کغراب، تالیف الامام الجامع ابی الفضائل رضی الدین الحسن بن محمد بن الحسن بن حیدر العمر الصغانی الحنفی اللغوی وھذا الکتاب فی عشرین مجلداً ولم یکمل لانہ وصل الی مادۃ "بکم" کما فی المزھر، ولہ مشارق الانوار وغیرہ توفی ۱۹ شعبان ۶۵۰ھ ببغداد عن ثلاث وسبعین سنۃ[2]

العباب بروزن غراب الامام الجامع ابو الفضائل رضی الدین الحسن بن محمد ابن الحسن بن حیدر العمری الصغانی الحنفی کی تالیف ہے، اور یہ کتاب بیس جلدوں پر مشتمل ہے، وہ اس کو مکمل نہیں کر پائے اور مادہ "بکم" تک پہنچ پائے ہیں جیسا کہ (سیوطی کی) مزہر میں ہے ان کی مشارق الانوار بھی ہے اسکے علاوہ اور بھی تصانیف ہیں، انکا انتقال ۱۹ رشعبان ۶۵۰ھ کو ہوا جبکہ ان کی عمر ۷۳ سال تھی۔

[1] دول الاسلام مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۱۱۸ [2] شرح خطبۃ المصنف در تاج العروس

مشارق الانوار مطبوعہ استنبول اور نزہۃ الخواطر میں دیے گئے، سنین کو خشتی صاحب نے خود ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، باقی رہی وہ تاریخ جو ہدیۃ العارفین میں ہے، تو وہ بھی اعتبار کے قابل نہیں ہے، اس لیے کہ اس کتاب کے ماخذوں میں تاج العروس موجود ہے اور یہ بعید نہیں کہ صاحب ہدیۃ العارفین نے سنہ ولادت تاج العروس کے مادہ "صغن" سے لیکر نقل کیا ہو۔

اب رہیں العباب کی عبارتیں جن سے خشتی صاحب نے ۵۵۵ھ کی صحت میں قیاس آرائی کی ہے، تو ان کی حقیقت حسب ذیل ہے: پہلی عبارت عباب کے مادہ "بیض" میں ہے:[1]

سمعت والدی المرحوم بغزنة فی شهور سنة نیف وثمانین وخمسمائة یقول: کنت اقرأ کتاب الحماسة لابی تمام علی شیخی بغزنة ففسر لی هذا البیت: بیض مفارقنا تغلی مراجلنا نأسو باموالنا آثار ایدینا واوّل لی قوله "بیض مفارقنا" مائتی تاویل، فاستغربت"

میں نے ۵۸۰ھ سے کچھ اوپر غزنہ میں اپنے والد مرحوم سے سنا ہے، وہ فرماتے تھے کہ جب میں ابو تمام کا حماسہ اپنے استاذ سے غزنہ میں پڑھ رہا تھا، تو انھوں نے اس شعر بیض مفارقنا.. کی تشریح میں .... دو سو تاویلیں کیں (پھر صغانی کہتے ہیں) مجھے اس پر بہت حیرت ہے۔

اس کے ساتھ ہی دوسری عبارت بھی ملاحظہ فرمائیں جو العباب کے مادہ "حصر" میں ہے، فرماتے ہیں:

[1] العباب کا مخطوطہ ایا صوفیہ استنبول میں ہے جس کا فوٹو سٹیٹ ادارہ تحقیقات اسلامیہ اسلام آباد (پاکستان) میں ہے، اس میں ملاحظہ ہو مادہ : بیض

سألنی والدی، تغمده الله تعالی برحمته واسکنه بحبوحة جنته بغزنة قبل سنة تسعین وخمسمائة وانا اذ ذاک اسحب مطارف الشباب فی رغد العیش اللباب وهو یفید فی غرر الفوائد و یرزقنی درر الفوائد وکان رحمه ریّانا من الفضائل ظمآنا عن الرذائل، عن معنی قولهم: "قد أثر حصیر الحصیر فی حصیر الحصیر" فلم ادر ما اقول. فقال: "الحصیر الاوّل البارية والثانی السجن والثالث الجنب والرابع الملک"[1]

میرے والد نے، اللہ ان پر رحمت کرے اور جنت میں انھیں جگہ دے، غزنہ میں ۵۹۰ھ سے قبل مجھ سے پوچھا، جب کہ میں نہایت خوشحال زندگی کے دور شباب سے گذر رہا تھا وہ مجھے علم کی اچھی باتوں سے نوازتے تھے، اور میرے دامن کو بے مثال موتیوں سے بھرتے تھے اس وقت وہ فضائل کا ابر باراں بنے ہوئے تھے، اور رذائل سے کوسوں دور (ایسے وقت میں) انھوں نے مجھ سے اہل عرب کے قول قد اثر حصیر الحصیر فی حصیر الحصیر کے معنی پوچھے، مجھے اس کے معنی معلوم نہ تھے، تو انھوں نے بتایا کہ پہلا حصیر بوریہ کے معنی میں، دوسرا قید خانہ، تیسرا بمعنی پہلو اور چوتھا بادشاہ کے معنی میں ہے۔

یہ یاد رہے کہ العباب صغانی کی زندگی کے انتہائی آخری ایام کی تالیف ہے، اس وقت صغانی لاہوری کو اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے واقعات کے سنین صحیح طور پر یاد نہیں رہے

[1] العباب مادہ : حصر

اسی لیے وہ "کچھ اور" (نیف[1]) کے ساتھ سنین کا تعین کرتے ہیں، ان کو صرف اپنے والد کی وفات (تقریباً ۵۹۰ھ) اچھی طرح یاد ہے، کیونکہ ان کے لیے یہ بڑا اہم واقعہ تھا، اسی لیے وہ اپنے واقعات کا تعین اسی سنہ کے سنگ میل سے کرتے ہیں۔

پہلے واقعہ میں ۵۸۰ھ کے ساتھ "نیف" کا استعمال اس تاریخ کو ۵۸۹ھ تک کر دیتا ہے، اور دوسرے واقعے میں تو "نیف" کا اشتباہ بڑے عمدہ طریقے سے دور کر دیا گیا ہے، فرماتے ہیں: قبل تسعین وخمسمائۃ (۵۹۰ھ سے قبل)، دونوں عبارتوں پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں واقعات بالکل قریب قریب کے ہیں، بلکہ عجب نہیں کہ ایک ہی سال کے اندر واقع ہوئے ہوں، اس صورت میں اس سنہ کا تعین ۵۸۹ھ کے حق میں بہت زیادہ قرین قیاس ہے، یہ بھی دیکھئے کہ دوران تعلیم میں علامہ صغانی کے والد کا معمہ: "قد اتحصیر الحصیر فی حصیر الحصیر" پوچھنا اس بات کی دلیل ہے کہ صغانی کے لڑکپن کا زمانہ تھا، کیونکہ ایسے معمے چھوٹی عمر ہی میں پوچھے جاتے ہیں، پختہ ذہن جوان سے ایسے معمے پوچھنا ناموزوں معلوم ہوتا ہے، چشتی صاحب نے اس واقعہ کے وقت صغانی کی عمر ۵۸۹ھ ـ ۵۵۵ھ = ۳۴ سال بتائی ہے اور اسکے شواہد لائے ہیں،[2] اور ایسے عبقری سے ۳۴ سال کی عمر میں ایسا معمولی سا معمہ پوچھنا بالکل مضحکہ خیز ہے، اسی طرح "وانا اذ ذاک اسحب مطارف الشباب" کو چشتی صاحب کا صغانی کی جوانی کے ثبوت میں پیش کرنا، اور پھر صغانی کی عمر ۳۴ سال

[1] نیف کی توضیح القاموس میں ایسے ہے: یقال عشرۃ ونیف وکل مازاد علی العقد فنیف الی ان یبلغ العقد الثانی (ترجمہ) کہا جاتا ہے: دس اور کچھ، جو دہائی سے بڑھ جائے وہ نیف کہلاتا ہے حتی کہ وہ دوسری دہائی تک پہنچ جائے۔ [2] ملاحظہ ہو معارف محولہ بالا، ص ۱۵

تک لے جانا بھی مستبعد ہے، اس لیے کہ یہ جوانی کا آخری حصہ ہے، ابتدائی نہیں، اور اسحب مطارف الشباب آغاز شباب کا مظہر ہے۔

الغرض ان عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان واقعات کے وقت صغانی کی عمر تیرہ چودہ برس تھی، جو رغد العیش کا زمانہ ہے۔

باقی رہا صغانی کا یہ بیان کہ

انی شرقت وغربت فی الہند ۔۔۔ میں ہندوستان اور سندھ میں تقریباً
والسند نیفا واربعین سنۃ ۔۔۔ چالیس سال تک پھرتا رہا ہوں۔

تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ صغانی نے ان چالیس برسوں میں وہ سارا عرصہ شمار کیا ہے جو دیار عرب میں جانے سے قبل اور سفارت کے دوران ہند میں گذارا ہے۔ یہ یاد رہے کہ امام صغانی ۵۹۹ھ میں ہند سے دیار عرب گئے ہیں، ۶۱۶ھ میں پہلی مرتبہ سفیر بنا کر ہندوستان بھیجے گئے، اور ۶۲۴ھ میں بغداد واپس ہوئے، پھر اسی سال دوسری مرتبہ سفارت پر ہندوستان آئے اور ۶۳۷ھ کو بغداد واپس ہوئے، اس طرح ان کا ہندوستان میں قیام یہ ہوا۔

دیار عرب کی طرف روانگی سے قبل ہندوستان میں عمر: ۵۷۷ تا ۵۹۹ = ۲۲ سال
پہلی مرتبہ سفارت کے لیے ہندوستان میں قیام: ۶۱۶ تا ۶۲۴ = ۹ سال
دوسری " " " " ۶۲۴ تا ۶۳۷ = ۱۳ "
ہندوستان میں مجموعی قیام : ۴۴ سال

یہ عین ممکن ہے کہ اس عرصہ کے علاوہ بھی صغانی نے ہندوستان میں قیام کیا ہو، مگر ہمارے اس حساب کے مطابق ۴۴ سال کا قیام ثابت ہے، اگر بچپن کے چار سال

نکال دیے جائیں تو صغانی کا یہ قول بالکل صحیح ہے، مگر اصل بات یہ ہے کہ جہاں یہ جملہ استعمال ہوا ہے وہاں حتمی طور پر ہندوستان میں چالیس برس کی مدت بتانا ہرگز مقصود نہیں بلکہ اپنی بات کو زوردار بنانے کے لیے یہ مدت بتائی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی دریا ہے جس کا نام "دکنکس" ہے، اسے ابن عباد نے الخلیل کے حوالے سے ہند کا دریا بتایا ہے۔ اس پر امام صغانی فرماتے ہیں کہ "میں تقریباً چالیس برس تک ہند و سند میں پھرا ہوں مگر مجھے خود اس نام کا دریا وہاں کوئی نظر نہیں آیا"[1]۔ ظاہر ہے یہاں اس مدت کا ذکر صرف قول کو مضبوط بنانے کے لیے کیا گیا ہے، اصل مقصود مدت بتانا نہیں، پھر بھی اگر وہ مدت شمار کر لیجائے، جیسا کہ اوپر کیا گیا ہے تو اس کے مطابق بھی یہ سنہ ولادت بالکل درست ہے۔

اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ صغانی لاہوری کا سنہ ولادت ۵۷۷ھ ہی ہے، جو سب مورخین نے بالاتفاق نقل کیا ہے، اس میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا۔

[1] العباب مادہ دکنکس

عظمت اللہ بے خبر کے "رسالۂ غبار خاطر"
کا
ایک مطبوعہ نسخہ

از جناب محمد اقبال صاحب مجددی، لاہور

"معارف" فروری ۱۹۶۸ء میں جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد نے رسالۂ "غبار خاطر" کا اپنا ذاتی قلمی نسخہ شائع کرکے علمی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے، لیکن ان کے مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالۂ مذکورہ کا مطبوعہ نسخہ غالباً ان کی نظر سے نہیں گذرا، یہاں اسی مطبوعہ نسخے کا تعارف اور موازنہ مقصود ہے۔

رسالۂ "غبار خاطر" کو نواب سید محمد صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی کتاب "خطیرۃ القدس و ذخیرۃ الانس"[1] مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۷ھ ص ۵۳۴ تا ص ۵۳۸ میں من و عن نقل کرکے شائع کر دیا تھا، نواب صاحب نے رسالہ ہذا کے اختتام پر تقریباً ایک صفحے کا تبصرہ بھی کیا ہے۔

راقم السطور نے ڈاکٹر صاحب کے شائع کردہ نسخے اور نواب صاحب کے نسخے کا موازنہ کیا اور اکثر جگہ عبارتوں کو بہت مختلف پایا، یہاں عبارتوں کے ان اختلافات کو درج کیا جاتا ہے۔

[1] راقم الحروف مخدومی مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی کا صمیم قلب سے ممنون ہے کہ انھوں نے میری استدعا پر "خطیرۃ القدس" کا نسخہ عنایت فرمایا اور اس باب میں اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

اختلافاتِ نسخ

نسخۂ ڈاکٹر صاحب	نسخۂ نواب صاحب
ص ۱۲۹۔ ستایشِ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ بالاتر ازیں نیست کہ وجودش واجب مبدا است ونعت محمد مصطفیٰ بیش ازیں نخواہد بود کہ ذاتش مظہر اتم وخاتم الانبیاست صلی اللہ علیہ وسلم بدیں ہر دو مستعدانِ طلب الٰہی مخفی نماند[1].....	
ص ۱۲۹..... کہ ہر یک بر دین وآئین خود مستقل اند	ص ۵۳۴..... کہ ہر یک بر دین وآئین خود مستقل است
ص ۱۲۹..... قول دیگرے را معتبر نمیدانند بلکہ باہم آنقدر.....	ص ایضاً..... وقول دیگرے را ہرگز معتبر نمیدانند بلکہ آنقدر باہم.....
ص ایضاً..... یکے ازیں ادیان بغیر ثبوت حقیقت او نبود چکند.....	ص ایضاً..... یکے ازیں ادیان بغیر ثبوت حقیقت او نبود چکند
ص ۱۳۰..... دگر آنجا خرق عادات است اینجا معجزہ وکرامت	ص ایضاً..... واگر آنجا استدراج وخرق عادات ست اینجا معجزہ وکرامت ست
ص ایضاً..... کہ ہیچ یکے از دیگرے نقصانے ندارد وسوائے ایں دلیل حقیقت خود ہا را ہم نمی شناسید چہ کعبہ ودیر را دیدے کہ در آنہا چہ چیز است.....	ص ۵۳۵..... کہ ہیچکی از دیگری نقصانی ندارد وسوائے ایں دلیل حقیقت خود را ہم نشان میدہند چہ کعبہ ودیر را دیدے کہ در آنہا چیز ست.....

[1] منقولہ صدر ابتدائی عبارت نسخۂ نواب صاحب موجود نہیں ہے۔

نسخۂ ڈاکٹر صاحب	نسخۂ نواب صاحب
ص ۱۳۰..... اختیاری نبودند	ص ۵۳۵..... کہ اختیاری نیست.....
ص ایضاً..... بلکہ بعضے مردم را نسبت لباس امتیازی ست.....	مگر بعض مردم را نسبت بسائر ناس امتیازیست..
ص ۱۳۰..... در احاطۂ کسب مختلف ایشان در آمدہ باشد خالی از خیال نیست ع.....	ص ۵۳۵۔ در احاطۂ کشف مختلف ایشان در آمدہ باشد خالی از خیال نیست..... ع
ہر چہ در دل بگذرد غیر از خیالے بیش نیست نکتہ رنگینست گر اینہم بخاطر بگذرد	ہر چہ در دل بگذرد غیر از خیالی بیش نیست نکتۂ رنگین ست اینہم کہ بخاطر بگذرد
ص ۱۳۰..... بحال خود داشتند.....	ایضاً..... بحال خود میداشت.....
ایضاً..... وآنہا ہم بغفلت نفسانی...	ایضاً..... وآنہا ہم بعلت نفسانی....
ایضاً..... والاچہ کمال دارند	ایضاً..... ورنہ چہ کمال دارند.....
ع اشک پرورد ے کہ پنہاں جوہر دل شد چہ شد نالہ سروے کہ اینہم حلِ مشکل شد چہ شد	ع اشک پروردی کہ پنہاں جوہر دل شد چہ شد نالہ سردادی کہ آنہم حل مشکل شد چہ شد[1]
ص ۱۳۰..... مگر عمر خود را خواہ بغم خواہ بعیش بسر بردند ودر تلون زمانہ.....	.....غرضکہ عمر عزیز خود را خواہ بغم خواہ بعیش بسر بردند ہمیشہ در تلون زمانہ گرفتار ماندند[2]
ایضاً..... از ہمہ چیز تواں گذشت.....	..... از ہمہ چیز میتواں گذشت.....
ایضاً..... در عدم محتاج نبودے	..... در عدم محتاج بوجود نبودے.....
ایضاً..... بالحاصل ہر صاحبکمال کہ دارسی در	..... الحاصل ہر صاحبکمال کہ دارسی در راہ

[1] نسخۂ نواب صاحب میں صرف یہ ایک شعر مختلف ہے [2] گرفتار ماندند نسخۂ ڈاکٹر صاحب میں غائب ہے۔

نسخۂ ڈاکٹر صاحب	نسخۂ نواب صاحب
راہ حق سبحانہ ناقص است	حضرت سبحانہ وتعالیٰ ناقص ست۔
	وبہرصا جکمال کہ برخوری درطریق طلب الٰہی قاصر[1]
ص ۱۳۱ ہ	
ہزاراں جاں فدا بر احمد باک	
کہ میگوید کماہی ما عرفناک[2]	
آمدے	
ص ۱۳۱ دوربینان بارگاہ الست	دوربینان بارگاہ الست
جش ازیں دہ نبردہ اند کہ ہست	غیر ازیں پی نبردہ اند کہ ہست
.... اگر ترا شکی باشد خالصاً در راہ خدا	.... اگر ترا شک باشد خالصاً در راہ خدا بتاب
بشتافت وتماشای معاملات ومشاہدات	وتماشای معاملات مشاہدات مغریب ہ
مغریب ہ	....
ہر قدم مژگان گیر الست خار اینطریق	ہر قدم مژگان گیرائی ست خار ایں طریق
مردم باید کزیں وادی سلامت بگذرد	مردمے باید کزیں میدان سلامت بگذرد
ص ۱۳۱ .... پس آں اقوال وافعال تو ناسخ	ص ۵۳۶ .. پس آں اقوال وافعال ہیچ توئی
اقوال وافعال ہیچ توئی راخطوط توانند شد...	راکسی توانند شد
ایضاً .... واز تو او اوست	ایضاً .... از تو داز اوست
ایضاً .... اگر از طرف خود برآید	ایضاً .... واگر بالفرض از طرف خود برآید
ایضاً .... انواع دیگر راچہ خبر کہ چیستی وکیستی گمر	ایضاً .... انواع دیگر راچہ خبر کہ کیستی وچیستی گمر

[1] نشان زدہ عبارت نسخۂ ڈاکٹر صاحب میں موجود نہیں ہے [2] نسخۂ نواب صاحب اس شعر سے خالی ہے۔

نسخۂ ڈاکٹر صاحب	نسخۂ نواب صاحب
ــــ از اندازہ تو علمی بہم سانند ...	از برائے تو کہ دستی داری علمی بہم سانند
ایضاً ... از گرگ علی ہذا القیاس ترس دارند...	ص ۵۳۶ .... از گرگ بہ ایش از گرگ ترس دارند وقس علیٰ ذالک
ایضاً ... ایں مدح تو قدح دار وتمام	ایضاً .... ایں مدح تو قدح تمام ست
ایضاً ... نہ بیچارہ چہ کرد کہ خونش را حلال میدانی...	ایضاً ... نہ بیچارہ چہ گناہ کرد کہ خونش حلال میدانی
.... فرض کردم کہ موقوت بر خونخواری شد	.... فرض کردم کہ زندگی موقوف بر خونخواری شد...
.... وعمر بسر می برد ویکا میرد تو ہم ہمیں طور داری۔	... وعمر بسر میبرد ومیمیرد تو ہم ہمیں طور داری..
ص ۱۳۲ ہ	ہ
تو خود رامی سنائی میشوی نیست	تو خود را میشناسی می شوی ہست
بذاتی کا ینچنیں یک عالمے ہست	ندانی کایں چنیں یک عالمی ہست
ایضاً .... مصلحت اینست	.... مصلحت ہمیں ست
ایضاً .. ہرگاہ موجود شد اطوار مادر وپدر را	.... ہرگاہ موجود شد جز اطوار مادر وپدر
می بیند واینہا نمی گذارند	نمی بیند وہم ایشان نیز نمی گذارند
ایضاً ... در ہر مذہب چندیں مجتہد اند کہ باہم	ص ۵۳۷ .... در ہر مذہب چندیں مجتہدین اند کہ
مختلف اند	باہم مخالف اند ....
ایضاً ... راہ پیروی نمیگذارند عجب کیفیتے است...	ایضاً .... راہ بردن نمیگذارند بوالعجب کیفیتی ست..
ص ۱۳۳ ... وطرفہ آں کسانے کہ رنجش فاطمہ رض	ایضاً وطرفہ تر آئین کسانیکہ رنجش خاطر فاطمہ رض
منظور دارند	را منظور دارند...
ایضاً ... کہ قید مذہب و مشرب اصل خرابی ایمانست ...	ایضاً کہ قید مشرب باعث خرابی اصل ایمان ست ....
ایضاً ... اما ازیں میر سید عباس ابی یوسف الشکلی	ایضاً ... اما ازین بلامیر ہند ...

نسخۂ ڈاکٹر صاحب	نسخۂ نواب صاحب
البغدادی فرمود کہ بحضرت حق سبحانہ مشغول باشد از مذہب او نباید پرسید[1]	
ص ۱۳۳ ...... و دلیل بریں سخن اختلاف یکدیگر اینہاست	...... و دلیل بریں سخن اختلاف یک دیگر اینہاست ؎
	در میان بحث ملایان میفگن خویش را بیخبر بگذار تا جنگند چندیں خرہم[1]
گرد ہزار دعویٔ باطل فشاندہ ایم اشکی کہ ماز حسرت انصاف ریختیم ؎	گرد ہزار دعویٔ باطل نشاندہ ایم اشکی کہ ماز مشرب انصاف ریختنیم ؎
ایضاً ...... لاچار اعتقاد ایں بروجود حضرت باری کو یکی سنگ قرار میدہند ہمہ اہل مذہب متفق اند	...... ناچار اعتقاد ایں ...... وجود حضرت باری تعالیٰ را گو یکی سنگ را قرار بدہد و دیگری چوب را ہمہ اہل مذہب متفق اند
...... و غضب بر کسی نکردن علی ہذا القیاس بر ہر چیزی ہمہ مخالفان جمعند حق باید دانست	و بر کسی غضب نکردن و قس علی ہذا بر ہر چیزی کہ ہمہ مخالفان موافق باشند حق باید دانست
...... و مردود آنکہ میل بدیگرے نماید فہم من فہم ؎	...... و مردود آنکہ میل بدین دیگرے نماید ؎
منت خضر تلخی مرگست تشنۂ حسرت زلال خودیم	منت خضر تلخی مرگ ست زندۂ مشرب زلال خودیم

[1] یہ عبارت نسخۂ نواب صاحب میں موجود نہیں ۱۲۔

ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف مضمون رسالہ پر تبصرہ سے معذرت کی ہے بلکہ موضوع رسالہ کی نشاندہی بھی نہیں فرمائی، واقعہ یہ ہے کہ بے خبر نے اپنے دور کے متلاشیانِ حق کے ذہنی اضطراب کی پہلے تفصیل دی ہے، پھر اُن کا حل پیش کیا ہے، یہ اضطرابِ ذہنی آج کے دور ترقی میں بھی خصوصاً جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں موجود ہے، جس کا حل آج بھی وہی ہے جو بیخبر نے پیش کیا ہے، اس لیے اگر ڈاکٹر صاحب اس پر توجہ فرماتے تو اس سے بہت فائدہ ہوتا، نواب صاحب نے شاید اسی نقطۂ نظر سے اس پر تبصرہ کیا ہے، اور وہ یہ ہے:

"تمام شد رسالۂ "غبار خاطر" خادم قوم و ملائم لوم عفا اللہ عنہ ما جناہ و استعملہ فیما یحبہ و یرضاہ میگویم کہ زبدۂ ایں بیان ترک تقلید جملہ مذاہب اسلام و اتیان اتباع حدیث و قرآن ست پس بس، ایں مدعا شک نیست کہ بر ہمن ست با دلۂ صحیحہ مقبولۂ موافق و مخالف زیرا کہ اہل مذاہب اربعۂ اسلامیہ بلکہ جمیع فرق ایں امت کتاب و سنت را اصول مشرب مدون و اسطقس مذہب متقن خود نشان میدہند و ہر یکی از ایشان آنچہ ازیں ہر دو اصل اصیل بمقدار علم و معرفت خود بعد از استفراغ جد و جہد فہمیدہ و دریافتہ آنرا حق قرار دادہ اند بعدہ تباین آراء و تفاوت افہام موجب وقوع ہائلۂ عظیمہ اختلاف در احکام ملیہ شدہ و تاایں جا مضائقہ در کار نیست البتہ ایں ست کہ ہر فرقہ از فرق اسلام مذہب خاص و مشرب ممتاز خود را بر حق و غیر خود را بر باطل مے پندارد و بداں در کتب دین و آئین خود تفوہ میکنند و ایں رخنہ از طرف مقلدین و متمذہبین در بناء دار الامان ملت حقہ خزیدہ نہ از جانب مجتہدین کہ مانع اند از تقلید خود و تقلید دیگران و ایشان

اجتہاد کردہ اند ہنگام ضرورت نزد عدم وقوف بر ادلۂ شارع و پیروان ایشان تقلید میکنند تفریعات خیالیہ را ص ۵۳۶ و باوجود اطلاع بر براہین قرآنیہ و حدیثیہ پای از جادۂ راہ مسلوک خود بر نمی دارند، پس این ہمہ ملالت و ملامت راجع ست بسوی ایشان نہ بسوی پیشینیان کہ قائم اند بر پیروی صرافت خبر و محوضت سنن و لہذا راہ اتباع کتاب و سنت از ہمہ خار و خس صاف آمد و از جملہ انجاس و خاشاک قیود و رسوم و ادران تقلیدات شوم مبرا افتاد، پس مقبول کسی ست کہ سالک مسلک اتباع حقیقی ست و با ہیچ مذہب کار نمی دارد و مطمح نظر او در ہمہ اصدار و ایراد کتاب عزیز و سنت مطہرہ ست خواہ بامذہبی موافق باشد یا مخالف مذہب موافق صواب ست و مذہب مخالف خطا و مردود کسی ست کہ در دین چیزی احداث کردہ ست کہ بران امر شارع نیست خواہ آں چیز تقلید مذہب باشد یا امر دیگر، و مسلک حق را منحصر در مذہب خود می پندارد و طریقۂ دیگرے را باطل میشمارد و انقطاع این طریقت راہ جمعی جم از مدعیان اسلام زدہ اند و عموم این آفت سبب گمراہی عالمی از شاہراہ سنت بیضا گردیدہ و ازینجاست کہ اختلاف اقوال و تباین آراء در اسلام تا آنجا سر کشیدہ ست کہ ہیچ قول و عقیدہ و عمل در مذہبی نباشد کہ اخلاف آں در مشرب دیگر موجود نبود و بجای خود مبرہن نگردیدہ پس اندیشۂ ترجیح بمذہبی و طریقۂ بر طریقۂ چیزی نیست و لا یزالون مختلفین الا من رحم ربک سعادتی بہتر ازاں در تصور نمی گنجد کہ ظاہر و باطن خود را مطابق کلام الٰہی و سنت رسالت پناہی سازد[۱]۔"

---

[۱] منقول از حظیرۃ القدس و ذخیرۃ الانس ص ۵۳۸ تا ۵۳۹ مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۷ھ۔

مطبوعات جدیدہ

شیخ عبداللہ، کشمیر اور ہم ۔ مرتبہ جناب محمد عتیق صدیقی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۸، مجلد مع گردپوش، قیمت لعہ پتہ :۔ مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی۔

جناب محمد عتیق صدیقی اردو کے خوش سلیقہ ادیب اور شگفتہ نگار اہل قلم اور پکے نیشنلسٹ ہیں، اس لیے قومی و ملکی مسائل پر بھی وہ برابر سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان کا سب سے بڑا متنازعہ فیہ مسئلہ کشمیر بھی ان کے بحث و نظر کا خاص موضوع ہے، اور "نیا کشمیر" کے نام سے وہ ایک کتاب کی تالیف میں مشغول ہیں، اسی کتاب کی ترتیب کے دوران میں ان کو شیخ عبداللہ اور کشمیریوں سے ملنے کا موقع ملا تو وہ تمام الزامات جو گذشتہ بیندرہ برسوں سے سرکاری و غیر سرکاری طور سے ان پر لگائے جاتے ہیں اور جو خود ان کے ذہن میں بھی تھے، رفع ہو گئے، اس لیے اصل کتاب سے پہلے انھوں نے یہ کتاب مرتب کی جو ان کے گہرے اور حقیقت پسند انہ مطالعہ کا نچوڑ ہے، لائق مصنف نے بڑی سچائی اور جرأت سے کشمیر میں شیخ کی مقبولیت اور تصفیۂ کشمیر میں ان کی اہمیت کو دکھایا ہے، اور ان کے بارہ میں ہندوستانی لیڈروں کی معلومات کو ناقص اور بیجا اشتعال کا نتیجہ قرار دیا ہے، اس کے ثبوت میں ان کی دو قومی نظریہ کی مخالفت، قبائلی حملہ کے دوران میں شاندار کردار، گاندھی جی کے اصولوں کی پابندی، پنڈت نہرو سے مخلصانہ تعلقات اور قوم پروری و حب الوطنی

کو پیش کیا ہے، اور انکی ذہنی تبدیلی کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان میں بڑھتی ہوئی عصبیت پسندی، کشمیر کی دستوری حیثیت کو ختم اور اس کے ہندوستان میں مکمل انضمام کی کوششوں، ملازمتوں میں کشمیری مسلمانوں کے نظرانداز کیے جانے، ۵۳ء میں شیخ کی گرفتاری، بخشی غلام محمد کے نامناسب رویہ اور ہندوستانی لیڈروں کی جھنجھلاہٹ وغیرہ کا پورا جائزہ لیا ہے، اور ۵۸ء و ۶۴ء میں ان کی رہائی و گرفتاری، پنڈت نہرو کے آخری دنوں میں تنازعہ کشمیر کو حل کرنے کی کوشش اور سفر ج وغیرہ کے واقعات میں بھی انکا کردار بے داغ دکھایا ہے، آخری باب میں کشمیریوں پر ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے اثرات، ہندوستانی مسلمانوں سے شیخ اور کشمیریوں کی شکایت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، شیخ صاحب اور کشمیر اس طرح لازم ملزوم ہیں کہ ان کی بیس سالہ (۴۷ء تا ۶۶ء) زندگی کے واقعات میں اس دور کی کشمیر کی سرگذشت بھی آگئی ہے، ان تمام مباحث میں مصنف نے کشمیری عوام کے تاثرات، اسمبلی اور پارلیمنٹ کے بیانات اور بعض دوسری اہم شخصیتوں کی تقریروں کے حوالوں سے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل کیا ہے، یہ کتاب کشمیر اور شیخ عبداللہ کے متعلق حقیقت پسندانہ معلومات کا نہایت مفید ذخیرہ اور اس لائق ہے کہ انگریزی میں بھی ترجمہ کیجائے۔

ریاست - مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۰۶ مجلد قیمت قسم اول ۱۵ روپے قسم دوم ۱۲ روپے

ناشر ساہتیہ اکیڈمی، دہلی۔

یونان کے نامور فلسفی افلاطون کی مشہور اور علم سیاست کی کلاسیکل کتاب "دی ریپبلک" کا ۱۹۳۲ء میں موجودہ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب نے اردو ترجمہ کیا تھا جو اسی زمانہ میں ان کے بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا، اب ساہتیہ اکیڈمی نے اسکو

دوبارہ مزید اہتمام سے شائع کیا ہے، اس اڈیشن کے آخر میں حواشی کا اضافہ بھی ہے، جو متن میں درج یونانی اشخاص و مقامات کی وضاحت پر مشتمل ہیں، اور ڈاکٹر صاحب نے ترجمہ میں ترمیم بھی کی ہے، اس لیے صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے یہ اڈیشن پہلے اڈیشن سے بہتر ہوگیا ہے، ترجمہ کی شگفتگی و سلاست کے لیے ڈاکٹر صاحب کا نام ہی ضمانت ہے۔

کچکول نامہ - مرتبہ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۲ قیمت درج نہیں، پتہ: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر حیدرآباد، پاکستان

بارہویں صدی ہجری کے سندھی علما، وصلحاء میں مخدوم ابوالحسن داہری نقشبندی کی ذات بہت ممتاز تھی، وہ شریعت و طریقت اور علوم ظاہر و باطن دونوں میں جامع تھے، سلوک و معرفت، وعظ و ارشاد اور درس و افتا، ان کا اصلی مشغلہ تھا، چند تصانیف بھی اُن سے یادگار ہیں، اُن میں یہ منظوم رسالہ بھی ہے، اس میں شیخ نے شریعت و طریقت، کشف و معرفت، ناسوت و ملکوت، جبروت و لاہوت، اعیان ثابتہ، عالم عقول و ارواح، روح طبعی، نفس ناطقہ وغیرہ جیسے مسائل کلام و تصوف پر دقیق بحث ...... اور بعض نقشبندی اصطلاحات کی لطیف شرح کی ہے، کہیں کہیں یونانی و مسلم فلاسفہ کے گمراہ کن خیالات کی تردید بھی کی ہے، یہ رسالہ مثنوی کے طرز پر ہے، فاضل مرتب نے فارسی میں بعض توضیحی حواشی اور شروع میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے اسمیں مخدوم صاحب کے مناقب و کمالات اور ان کی تصنیفات کا تعارف کرایا گیا ہے، رسالہ مختصر ہونے کے باوجود مفید اور بلند مطالب پر مشتمل ہے، لیکن اس کے مباحث دقیق و غامض ہیں۔

چہ قلندرانہ گفتم ۔ مرتبہ جناب شورش کاشمیری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۴۴۱، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت قسم اول للعہ قسم دوم سے/ پتہ مطبوعات چٹان لمیٹڈ، ۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور۔

یہ جناب شورش کاشمیری مدیر چٹان کا نیا مجموعۂ کلام ہے، جو ان کی قلندرانہ نظموں پر مشتمل ہے، اس کے شروع میں حمد و نعت کی نظمیں ہیں، اور آخر میں فکاہی اور مزاحیہ، شورش صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ عشق ہے، اس لیے انھوں نے بارگاہ رسالت میں پرخلوص نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے، اور ذات نبویؐ کے متعلق بعض مذہبی رہنماؤں اور اشخاص کے غلط افکار و اعمال کی پر زور تردید بھی کی ہے، گو اس کا لب و لہجہ تلخ ہو گیا ہے، لیکن وہ شاعر کے اخلاص و دردمندی کا ثبوت ہے، مجموعی حیثیت سے اس مجموعہ کی نظموں میں بڑی روانی اور برجستگی اور آمد و بیساختگی ہے اور وہ شورش صاحب کی ولولہ انگیز اور پرجوش طبیعت کی غماز ہیں،

گلِ صحرا ۔ مرتبہ جناب طالب جے پوری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ/ پتہ: طالب جے پوری ۱۸ ہیسٹنگز روڈ، الہ آباد

جناب طالب جے پوری ایک خوش گو، خوش فکر اور کہنہ مشق شاعر اور نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، گلِ صحرا ان کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے، جو پچاس غزلوں اور اٹھارہ نظموں پر مشتمل ہے، مصنف کا ذوق پاکیزہ اور رنگ قدیم مگر پختہ ہے، نظمیں بھی قادر الکلامی اور خوش ذوقی کا ثبوت ہیں، بربریت، حال و ماضی، احتیاج، دو مورتیں، اور استقبال وغیرہ موثر نظمیں ہیں، اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کا احساس دور حاضر کے پر آشوب حالات سے بیگانہ نہیں ہے، شروع میں ان کے استاذ حبیب احمد صدیقی کا پیش لفظ اور مصنف کا مقدمہ ہے، مقدمہ میں طالب صاحب نے اپنے وطن جے پور کے ادبی و تہذیبی حالات اور اپنے شعر و سخن سے تعلق کی روداد تحریر کی ہے۔

"ض"